رسالہ ذخیرہ معلومات وخزانہ تحقیقات

مسماۃ بہ

رسالہ تقیہ

مصنف

حضرت شمس العلماء الکرام بدر الفقہاء العظام سید المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین،

کہف الایمان والمومنین آیۃ اللہ فی العالمین ناشر آثار آبائہ المصطفین مولانا

السید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

ترتیب و تخریج

علامہ آفتاب حسین جوادی

مصنف کتاب مستطاب عبقات الانوار واستقصاء الافحام وغیرہ

کا اردو ترجمہ دائرہ تحقیق کھجوا کی کوشش سے

مطبع اصلاح مشین پریس کھجوا میں چھپ کر شائع ہوا

الحمدلہ

کہ

رسالہ ذخیرہ معلومات وخزانہ تحقیقات

مسماۃ بہ

رسالہ تقیّہ

مصنف

حضرت شمس العلماء الکرام بدر الفقہاء العظام سلطان المحققین سید المتکلمین حجتہ الاسلام والمسلمین کہف الایمان والمومنین آیۃ اللہ فی العالمین ناشر آثار آبائہ المصطفین مولانا

السید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

مصنف کتاب مستطاب عبقات الانوار واستقصاء الافحام وغیرہ

کا اردو ترجمہ

دائرہ تحقیق کھجوا کی کوشش سے

اصلاح مشین پریس کھجوا میں چھپ کر شائع ہوا

نام کتاب : رسالہ تقیہ

مصنف : علامہ سید حامد حسین رحمۃ اللہ علیہ

مترجم : علامہ محمد باقر کھجوئی

ترتیب وتخریج : علامہ آفتاب حسین جوادی

نظر ثانی و پروف: سید اظہار بخاری

تعداد : ایک ہزار

اہتمام : مرکز مطالعاتِ اسلامی پاکستان

سرِ ورق و آرائش: سجاد حیدر دیوالِ (خوشاب)

قیمت : روپے

ناشر۔ : النور اکیڈمی گاہی سیداں ضلع راولپنڈی

ملنے کا پتہ : محمد علی بک ڈپو۔ جامع الصادق۔ جی نائن اسلام آباد

انتساب

یہ کتاب مستطاب

عزت مآب علامہ سید قلب عباس کاظمی مدظلہ العالی
(گاہی سیداں راولپنڈی) کے والدین مرحومین
حضرت مولانا سید نور حسین شاہ رحمتہ اللہ علیہ

و

سیدہ رسول بی بی رحمتہ اللہ علیہا

نور اللہ مرقدہما

کی ارواح کے ایصال ثواب کے لیے شائع کی گئی ہے

اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت کاملہ سے سرفراز فرماتے ہوئے شفاعت محمدؐ و آل محمدؐ
نصیب اور جوار و قربِ آل محمد نصیب فرمائے اور اعلیٰ علیین میں مقام
خاص و بلند عطا فرمائے۔

مندرجاتِ کتاب (فہرست عناوین)

❀❀❀

گفتارِ اوّل

تقیہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جس نے انکار کوئی نہیں کر سکتا سوائے ان متعصبانہ اور معاندانہ انکار کے حامل افراد کے' جو محض اپنی ذاتی' اغراض کی وجہ سے اس غیر مبہم اور واضح حقیقت کا انکار کر دیتے ہیں۔ البتہ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ تقیہ ہمیشہ واجب اور ضروری ہو بلکہ مختلف حوادث و کیفیات کے بدلنے سے تقیہ کے احکام بھی اسی کے مطابق بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے تقیہ کبھی واجب ہے تو کبھی حرام اور کبھی مستحب و مباح ہے تو کبھی مکروہ قرار پاتا ہے۔ لہذا تقیہ بالاتفاق جائز عمل ہے۔

برصغیر کے بطلِ جلیل سرکار علامہ سید حامد حسین لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ مختلف ہمہ جہت علوم کے امام ہیں۔ ان کی جملہ تصانیف بالخصوص عبقات الانوار' استقصاء الافحام' جیسی معرکتہ ال آرا کتب پوری آب و تاب کے ساتھ آسمانِ علم و تحقیق پر روشن ستاروں کی مانند چمک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک رسالہ تقیہ بھی ہے جو موضوع کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اگرچہ تقیہ کے موضوع پر بہت سے علمی رسائل اور کتب موجود ہیں مگر علامہ موصوف کا پیش کردہ زیرِ نظر رسالہ اس میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اکابرین نے اس رسالہ کو علامہ موصوف کی انتہائی علمی مگر عام فہم روش اور حق کے متلاشی افراد کے لیے شمعِ ہدایت قرار دیا ہے۔

اس رسالے میں فاضل مصنف نے تقیہ جیسی حقیقت کا انکار کرنے والے

تمام تر نظریات کو انتہائی مدلل اور احسن انداز میں رد کیا ہے۔ قرآن و حدیث اور تعامل صحابہؓ کی روشنی میں تقیہ کے جواز اور اصل حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔
اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس رسالہ علمی کا شائع ہو کر عوام الناس تک پہنچنا انتہائی ناگزیر ہو چکا ہے تاکہ ہر علم دوست اور محقق کے لیے تقیہ کی حقیقت واضح و آشکار ہو جائے اور تقیہ کے حوالے سے منفی پروپیگنڈہ کرنے والے دریدہ دہن طبقے کی زبان بندی ہو سکے۔ بنابریں یہ رسالہ محترم قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہو رہا ہے۔ الحمد علی ذلک۔
اللہ تعالیٰ سب کو حق سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

الاحقر
آفتاب حسین جوادی
۱۲ مارچ ۲۰۲۱ء۔ اسلام آباد

حالاتِ زندگی

السید میر حامد حسین قبلہ

(۱۲۴۶/ ۱۳۶۰ھ)

(۱۸۳۰/ ۱۸۸۸ء)

برصغیر کے جن علماء کی عرب وعجم میں علمی عظمت تسلیم کی گئی ہے۔ ان میں علامہ حامد حسین قبلہ فردوس م آب کا نام سرفہرست ہے۔ اودھ کے زوال اور ملک کی ابتری کا عہد تھا۔ سیاسی وذہنی خلفشار نے علمی کام کے لیے فضاء خراب کردی تھی۔ شیعہ اقتدار کو زوال ہوا لکھنئو طوفانوں کی آماجگاہ بنا۔ چھوٹے بڑے ہوگئے۔ نظام درہم برہم ہوگیا۔ شیعوں پر سیاسی اور مذہبی حملے شدت اختیار کر گئے۔ علماء منتشر ہوگئے۔ کتاب خانے لٹ گئے۔ سکون تباہ ہوگیا۔

اس بحران میں مولانا حامد حسین علوم اسلامی کی شمع فروزاں کو دامن سے چھپائے۔ جھگڑوں سے بچائے بیٹھے رہے اور سراپا انہماک بنے کام آگے بڑھاتے رہے۔ انہوں نے وسیع کتب خانہ قائم کیا۔ شیعہ سنی اختلافات پر عظیم الشان دائرۃ المعارف لکھی۔ بحث وتحقیق کی نئی راہ نکالی۔ علوم روایت ودرایت کو اجتہاد اور فکر انگیز حد تک پہنچایا۔ مناظرہ واستدلال کو نیا آہنگ بخشا اور فن تحریر واظہار کو نئی روایت عطا کی۔

عبقات الانوار' عظیم وضخیم کتاب ہی نہیں وہ ایک روایت بھی ہے اور درایت بھی۔ وہ ایک شخص کی عظمت وعزیمت کی مثال بھی ہے اور قوم کے لیے

سرمایہ عزت وافتخار بھی ہے۔

جمع وتالیف، مباحث ومسائل، مآخذ ومصادر پر گفتگو، وسعتِ نظر اور استدلال، استخراج، نتائج کے نقطہء نظر سے اسے جس نے دیکھا ہے داد ہی دی ہے۔ فارسی عبارت کا اسلوب، عربی خطبوں کا نہج، ایران وعرب کے علماء سے امامتِ فن کی سند لے چکا ہے۔ بڑے بڑے محدث ومحقق، یورپ وایشیاء کے اہلِ دانش وبینش عبقات کے مولف سے استفادہ شرف جانتے تھے۔ اکابر عالم کے خطوط کا ایک دفتر کتب خانہ ناصریہ میں محفوظ ہے۔ جو شائع ہونے کے لائق تھا مگر ملک میں ان نوادر کا قدردان کون ہے۔

مولانا حامد حسین نے صرف کتابیں ہی نہیں لکھیں بلکہ اپنی مماثل شخصیتیں بھی بنائیں۔ علامہ غلام حسنین کنتوری، علامہ سراج حسین، علامہ جسٹس کرامت حسین، علامہ تصدق حسین، علامہ ناصر حسین، علامہ عباس حسین، علامہ محمد مہدی ادیب ان کے غیر معمولی صحبت یافتہ بزرگ ہیں۔ میری کتاب تفصیل کی متحمل نہیں ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ اس اختصار اس عظیم عالم کے تذکرہ کمال سے مانع ہے۔ مختصر یہ ہے کہ:

نیشاپوری ساداتِ کاظمیہ کی ایک فرد واردِ ہند ہوئی۔ ان کے فرزند ابو المظفر علاؤ الدین حسین کنتور میں پیدا ہوئے۔ ان کی اولاد اسی علاقے میں پھلی پھولی آباد ہوئی۔ سیاست وریاست، ملک وملت کی خدمتوں کے صلے میں جاہ وجلال پایا۔

اسی خاندان کے ایک فرد حامد حسین تھے جن کے فرزند محمد حسین اور ان کے بیٹے محمد قلی حکومتِ اودھ اور لکھنو میں رہے۔ محمد قلی (دیکھیے احوالِ علوم دینیہ میں مرتبہ کمال تک پہنچ کر مفتی کہلائے اور تصنیف وتالیف کی بدولت

شہرت عام و بقائے دوام کے مالک ہوئے۔ مفتی محمد قلی صاحب نے تقدس و پاک ضمیری حاصل کی۔ جس زمانے میں وہ میرٹھ کے صدر الصدور تھے۔ ایک رات انہوں نے خواب میں اپنے جدِّ امجد سید حامد حسین صاحب کو دیکھا۔ بیدار ہوئے تو ولادت فرزند کی خوش خبری سنی۔ آپ نے اس مولود کا نام داد کے نام پر رکھا۔ آپ جن بزرگ کے مکان میں مقیم تھے انہیں آپ سے عقیدت تھی۔ فرزندِ نومولود کی کرامت کو دیکھ کر موصوف نے اس مکانِ ولادت اور سہ درہ کو امام باڑہ قرار دے دیا۔ اس طرح حامد حسین پیدائش کے بعد ہی سے تاسیس و تعمیر نو کا باعث بنے۔

آپ کی تاریخ ولادت ۵ محرم الحرام ۱۲۴۶ھ ہے۔ کم سنی میں فہم و فراست' ذہانت و ذکاوت ایسی کہ جو دیکھتا تعجب کرتا تھا۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ کو بسم اللہ ہوئی۔ ابتدائی اور وسطی علومِ متداولہ والد نے تعلیم دیئے۔ پندرہ سال کے ہوئے تو والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ (۹ محرم ۱۲۶۰ھ) ان دنوں آپ لکھنؤ میں تھے۔ اور یہاں ادب مولوی برکت علی حنفی اور مفتی محمد عباس سے معقولات خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ بن سلطان العلماء اور فقہ و اصول سلطان العلماء سید محمد صاحب اور علیین مکان سید حسین صاحب سے پڑھ کر سند حاصل کی۔

''مناہج التدقیق'' تالیف علیین مکان کا وہ نسخہ اب تک محفوظ ہے جس کو موصوف پڑھا کرتے تھے۔ اس پر زمانہ طالب علمی کے حواشی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تحقیق و معلومات و جودت ذہن کا کیا عالم تھا۔

تفسیر و حدیث' فقہ و اصول' کلام و ادب کے اساتذہ دیکھ رہے تھے کہ سید حامد حسین کی محنت و شوق انہماک و بصیرت قابلیت و عمل روشن مستقبل کی علامت ہے۔ وہی ہوا۔

تکمیل تعلیم کے بعد اپنے والد کے تالیفات کی ترتیب واشاعت کی طرف توجہ فرمائی۔ فتوحاتِ حیدریہ، رسالہ تقیہ، تشئید المطاعن وغیرہ کے بعد منتہی الکلام کے جواب میں استقصاء الافحام کی تالیف چھ ماہ میں مکمل کی۔ اس کے بعد شوارق النصوص کی تالیف میں حافظے اور قوتِ استدلال کو عروج پر پہنچا دیا۔

۱۲۸۲ھ میں حج وزیارات کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں اکابر علماء اسلام سے ملے۔ مکہ و مدینہ کے نوادر مخطوطات و کتب کی نقلیں اور ملخص حاصل کئے۔ اس سفر میں نواب تہور جنگ اور مولانا عزیز شاگرد مولانا تصدق حسین ساتھ تھے۔ تہور جنگ نے مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور علومِ اسلامی کی عظمت سے بہت اثر قبول کیا۔ یہ ہم سفری آگے بڑھ کر حیدرآباد دکن کے نئے علمی ارتقاء میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ علماء وادبا و شعراء لکھنو و کنتور کی دکن میں پذیرائی اور کتب خانہ آصفیہ کی عظمت میں یہ سفر فال نیک بنا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام پر بڑا اثر رکھتے تھے۔ مولانا محمد قلی صاحب میرٹھ میں کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے۔ ۵ محرم ۱۲۴۶ھ کو اسی میرٹھ میں مولانا حامد حسین پیدا ہوئے۔ اِس رات مفتی محمد قلی صاحب نے اپنے جدِّ امجد کو خواب میں دیکھا بیدار ہوئے تو ولادتِ فرزند کی خبر ملی اس لئے آپ نے حامد حسین نام رکھا۔ جس سہ دری میں آپ کی ولادت ہوئی تھی اس کو مالک مکان نے احتراماً امام باڑہ قرار دیا۔ مفتی صاحب کی شخصیت اور علمی وقار کے سائے حامد حسین صاحب کی ذہانت ودرّاکی بڑھتی گئی۔ خداداد برجستگی و حافظے نے روشن مستقبل کی نشاندہی کردی۔

۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ کو تقریب بسم اللہ ہوئی جس میں آپ نے یہ دعا پڑھی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ﴿۲۵﴾ وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۲۶﴾

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ ۔ رَبِّ يَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ وَادْفَعْ عَنِّيْ كُلِّ شَرٍّ

تقریباً پندرہ سال کی عمر تک اپنے والد صاحب سے پڑھا۔ مفتی محمد قلی صاحب کی رحلت کے بعد لکھنؤ کے مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مثلاً برکت علی صاحب اور مفتی محمد عباس صاحب (سے ادب) خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ صاحب (سے معقولات) سیدالعلماء سید حسین علیین مکان اور سلطان العلماء سید محمد صاحب رضوان م آب (سے فقہ و اصول) تمام اساتذہ آپ کی ذہانت و ذکاوت، حافظے اور محنت کی قدر کرتے تھے۔ شرح کبیر پڑھتے وقت آپ کی بحث نکتہ رسی کی مثال تھی۔

سیدالعلماء مولانا سید حسین صاحب قبلہ کی تالیف مناہج التدقیق پر مولانا کے حواشی و مباحث دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ طالب علمی میں ہی کمال فن تک پہنچ گئے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر آپ نے اپنے والدِ محترم کے تصانیف کی طرف توجہ فرمائی۔ انہیں مرتب کیا متن کی تصحیح و تحقیق کے بعد یکے بعد دیگرے شائع کیا۔

فتوحات حیدریہ ۔ تصحیح متن کے بعد خاتمے میں جو ادبی شان ہے اس سے مولانا کی اٹھان کی بلندی نظر آتی ہے۔

رسالہ تقیہ۔ تصحیح و ترتیب تشیید المطاعن ۔ تصحیح و تحقیق محنت و جانکاہی کے ایک عمل کے بعد ان کی اشاعت و طباعت کا اہتمام کیا۔

سفر حج و زیارات۔ ۱۲۸۲ھ میں نوجوانی کا عالم تھا اور شوق مطالعہ و تحقیق کا شباب، اس پر برادرِ بزرگ مولانا اعجاز حسین صاحب کا ساتھ سونے پر سہاگہ، لکھنؤ سے مکہ مکرمہ تک طالب علم جستجوئے علماء، تلاش کتب، تحقیق رجال و تتبع

حدیث کا سلسلہ رہا۔ جہاں گئے علماء نے استقبال کیا۔ افادہ و استفادہ کا بازار گرم رہا۔ اخذ روایت و نقلِ حدیث کی بات چلی تو معلوم ہوا سمندر سمندر سے مل گئے۔ کتب خانوں میں گئے تو کئی کئی دن مطالعہ و نقل و یادداشت میں نگاہ و قلم مصروف عمل رہے۔ بھائی بھی کتاب شناس و عاشقِ علوم‘ خود بھی مصنف و صاحبِ نظر‘ ہر لحہ نورانی‘ ہر آن علمی بنتی گئی۔ شیعہ و سنی محققین ملتے تو دم بخود رہ جاتے تھے کہ یہ حافظہ اور یہ مطالعہ؟؟ رواۃ‘ طبقات‘ انساب‘ اسناد پر یہ عبور‘ حدیث و جرح و تعدیل میں اتنی مہارت اللہ اکبر۔ مولانا سمندری راستے سے حج کے لیے چلے۔ دخانی جہاز جس بندرگاہ پر رکتا وہ اترتے‘ کتاب فروشوں سے کتب خریدتے اور جہاز پر واپس آ جاتے۔ یوں مدینہ منورہ و مکہ مکرمہ پہنچے تو بے شمار کتابیں ساتھ تھیں۔ حج کے بعد عراق و ایران گئے تو ذخیرہ اور بڑھ گیا۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب موسوی فرماتے ہیں ایک دن مدینہ منورہ میں ایک عرب نے مجھے روک کر پوچھا کہ تم آلِ سید حامد حسین موسوی سے ہو؟ میں نے کچھ تامل سے اپنا رشتہ بتایا اور پوچھا کہ آپ مجھے کیونکر پہچانے؟ انہوں نے فرمایا تمہارے جدِّ امجد نے اپنے سفر حج کے بعد ”عبقات الانوار“ نامی کتاب لکھی۔ جس میں ان مطالعات کی مدد سے اہل سنت کے مختلف النوع اعتراضات کے جواب دیئے اور وہ کتاب ہمارے والد کو بھیجی۔ ہمارے والد نے میر حامد حسین کا جو حلیہ بتایا تھا اس کے خدوخال تمہارے چہرے میں نظر آئے تو بطور قیافہ شناس میں سمجھ گیا تمہارا ان سے کوئی تعلق ہے۔

مولانا اعجاز حسین اور مولانا حامد حسین کا یہ سفر عہدِ قدیم کے ان حافظ و محدث حضرات کے سفر کا نمونہ تھا جو صحرا صحرا پھر کر شیوخ و آئمہ فن سے ملتے تھے۔ اور طلبِ حدیث کی خاطر ہزاروں دکھ اُٹھاتے تھے۔ مولانا اس سفر سے

جو کچھ لائے اسے "عبقات" کے ذریعے علماء تک پہنچا دیا۔
مولانا کی علمی حیثیت اور لکھنؤ میں ان کا احترام مسلّم تھا۔ اس سفر کے بعد وہ اسلامی دنیا میں عظمت واحترام کے مالک ہوگئے۔ مولانا محقق ومصنف بزرگ تھے۔ اور عوامی مشاغل ومعاملات کا وقت نہیں رکھتے تھے۔ اسکے باوجود ڈاکٹر اسپرنگر مصنف "فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ" اور دوسرے علمی افراد سے روابط تھے۔ انجمن تہذیب کے رکن تھے۔ پورے ملک کے شیعہ کلام وحدیث، فقہ وعلوم میں آپ سے رجوع کرتے تھے۔

مولانا حامد حسین زمین دار وباحیثیت آدمی تھے اس لیے کسی کے دستِ نگر نہیں تھے۔ جو کچھ آمدنی تھی سب کتب خانے پر خرچ ہوجاتی تھی۔ پورا وقت نذر تالیف وتصنیف تھا۔ برصغیر میں ہمیشہ اہلِ سنّت کی حکمرانی رہی۔ ہر دور میں شیعوں نے سیاسی اور جنگی میدانوں میں حکومت کی کمک کی مگر معاشرتی زندگی میں اور نجی معاملات میں جب بھی بات ہوئی تو بڑی بھائیوں نے چھوٹے بھائیوں کو زک پہنچائی۔ انہیں غیر سمجھا ان کی توہین کی۔

لفظ "رافضی" کو شیعہ کا مترادف قرار دیا۔ محمود غزنوی، فیروز شاہ تغلق، جہانگیر عالمگیر اور بہت سے سلاطین وامراء اور نوابین نے علماء کے قتل وجلاوطنی، شیعہ کتابوں کو جلانے اور مدرسوں کو تباہ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خود اکبر کا عہد جسے غیر مذہبی عہد کہا جاتا ہے جسے مورخ کبھی ایرانیوں کا سازشی دور یا ایرانیوں کی بالادستی کا عہد کہتے ہیں۔ اس زمانے میں شیعوں کے خلاف لٹریچر مکے مدینے سے لکھوا کر منگوایا جاتا تھا۔ "الصواعق المحرقہ" اس سلسلے کی ایک کتاب ہے۔ خود اندرون ملک ہر شخص شیعوں کے خلاف سخت تقریر وتحریر میں مصروف تھا۔

ملا احمد ٹھٹھوی کے دلیرانہ جواب کو ان کے قتل کا بہانہ بنایا گیا اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ان کی قبر کھودی گئی ان کی قبر جلائی گئی اور ملا عبدالقادر بدایونی نے سب و شتم کے کریہہ سے کریہہ الفاظ لکھ کر "منتخب التواریخ" کو سیاہ کیا۔ شیعوں کو ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کا حق نہیں تھا۔ "حکیم عبدالفتح" نے ہاتھ نہ باندھے تو عبدالقادر انگاروں پر لوٹ لوٹ گیا۔ عہدِ جہانگیری میں آگرہ شیعوں کے لیے "اکرہ بلاد اللہ" بن گیا۔ ممالک محروسہ تیموریہ میں شیعوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ ملا روز بہان کی "ابطال الباطل" اور ابن حجر کی "الصواعق المحرقہ" گھر گھر پھیل گئی۔ شیعوں کو چیلنج کہ جواب دو' شیعہ مذہب کا تمسخر اور ان کی بے دینی و بے علمی کا طعنہ تھا۔ نور اللہ شوستری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کا جواب لکھا تو جہانگیر کے حکم اور ملاؤں کے فتوے سے اِس سیدِ گھر والا اور عالمِ جلیل القدر کو جامِ شہادت پینا پڑا۔

یہ دونوں واقعے لاہور اور آگرہ جیسے دارالسلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملا احمد ٹھٹھوی کی شہادت ۹۹۶ھ لاہور میں ہوئی۔ اور قاضی نور اللہ شوستری شہیدِ ثالث ۱۰۱۹ھ آگرے میں شہید کئے گئے۔ اس کے بعد شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ نے ملک گیر سطح پر جو مہم چلائی اس کا ہلکا سے خاکہ ان کے مکتوبات میں موجود ہے۔ انہوں نے شیعوں کے خلاف تشدد کا پرچار کیا۔ شیعہ علماء پر حملے کئے گئے۔ ملا مقصود احمد تبریزی اور ملا احمد تیتی کے نام لکھ کر بہت کچھ کہا۔ شیخ احمد سرہندی کے دور میں شیعوں نے مجبور ہو کر جواب لکھے۔ اور نواب ابراہیم خان متوفی ۱۱۲۱ھ نے لاہور اور سوہدرہ (ابراہیم آباد) میں علماء سے سات جلدوں میں تمام اعتراضات و جوابات کا ایک مجموعہ "بیاض ابراہیمی" تیار کرایا۔ شیخ صاحب کے بعد ولی اللہ صاحب دہلوی نے پھر ان کے فرزند عبدالعزیز صاحب

متوفی ۱۲۳۹ھ نے باہمی جھگڑوں کو "تحفہ اثناء عشریہ" تک پہنچایا۔

عالمگیر سے شاہ عالم تک سیاسی طور پر شیعہ کمزور رہے۔ اب پھر ملک کو ایک مدبر اور جرنیل کی ضرورت پڑی اور تاریخ نے بیرم خان خانان کا متبادل نجف خان پیدا کیا جس نے روہیلے' مرہٹے اور جاٹ جیسے سرکشوں کو زیر کیا۔ دہلی' آگرہ اور دور دراز علاقوں سے باغیوں کو نکال باہر کیا۔ ذوالفقار الدولہ نجف خان نے ۱۱۹۶ھ/ ۱۸۲۴ء میں رحلت کی۔ ان کے بعد آگرہ اور اودھ پر شیعوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس دور میں شاہ عبدالعزیز (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) نے تحفہ اثناء عشریہ لکھی۔ اب پریس قائم ہو چکا تھا۔ تحفہ اثناء عشریہ کی تالیف کے دوران حکیم مرزا محمد صاحب نے دہلی سے ہی جواب لکھنا شروع کردیا۔ اُدھر کتاب چھپ کر باہر آئی تو اِدھر اس کا جواب "نزھۃ اثناء عشریہ" مکمل ہو کر چھپنے لگا۔ حکیم صاحب ۱۲۳۵ھ میں شہید کردیئے گئے۔ لکھنو آباد تھا کتب خانے وافر تھے علماء بااختیار تھے۔ لہذا وہاں اس کا ردعمل شدید ہوا اور متعدد علماء نے جواب لکھ ڈالے۔ جس میں جناب مفتی محمد قلی صاحب برآوردہ تھے۔ ابھی یہی گرما گرمی تھی کہ ملا حیدر علی صاحب نے شیعوں کے خلاف "منتہی الکلام" کے نام سے ایک اور کتاب لکھ ڈالی۔ مولانا حامد حسین صاحب نے اس کے جواب میں "استقصاء الافحام" قلم بند کی۔ اس کے بعد "عبقات الانوار" کے نام سے ایک مفصل کتاب شروع کی جو نہ صرف تحفہ اثناعشریہ کے باب انکارِ خلافت امیر المومنین کا جواب تھا بلکہ حدیث و رجال' مناقب و مناظرہ پر ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کتاب نے فن جدل و مناظرہ میں شیعوں کی بالادستی پر مہر ثبوت ثبت کردی۔

مولانا حامد حسین صاحب قبلہ کی اس کتاب کو دیکھ کر سید مرتضیٰ موسوی علم

الھدیٰ "الشافی ردالمغنی" اور سید نوراللہ موسوی شوستری کی "احقاق الحق" کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ مولانا حامد حسین صاحب موسوی کو قاضی نوراللہ شوستری رحمۃ اللہ علیہ سے خاص محبت تھی۔

۱۲۷۱ھ میں مولانا آگرہ تشریف لائے تو شہید ثالث کے مزار پر حاضری دی۔ یہ مزار ۱۰۱۹ھ سے ۱۱۸۸ھ تک آہستہ آہستہ شیعہ آبادی کے نہ ہونے سے کھنڈر بن چکا تھا۔ ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں ذوالفقار الدولہ نجف خان کے زمانے میں سید محمد منصور موسوی نیشاپوری صوبہ دار آگرہ نے آکر دوبارہ اس کی تعمیر کی۔ جناب آیت اللہ میر حامد حسین موسوی نے کم وبیش ایک سو پندرہ سولہ سال بعد اس دربار کی تعمیر وتجدید وآبادی کی طرف توجہ دلائی۔ اور دو سال بعد ۱۲۹۰ھ ڈپٹی سید علی نقی پہرسری کی سربراہی میں یہ عمارت از سرِ نو مکمل ہوئی۔ اور ۱۳۶۱ھ کے بعد سے اب تک یہ مقام یکسر بدل کر بہت شاندار آبادی بن چکا ہے۔

جناب حامد حسین کی ان علمی کوششوں کو دیکھ کر ایک جہان ان کا گرویدہ ہوگیا۔ علمائے ایران وعراق نے انہیں آیت اللہ فی العالمین، مجددِ ملت، محی الدین، حجۃ الحق علی الخلق کے القاب سے یاد کیا۔ آیت اللہ سید حسین طباطبائی یزدی، سید الفقہا سید حسین قمی، مرجع اکبر زین العابدین مازندرانی، محدثِ اعظم شیخ حسین نوری جیسے اکابر نے ان کو محقق ومحدث وحافظ وفقیہہ کے بلند ترین اعزازات کا حامل مانا۔

جناب حامد حسین صاحب قبلہ نے اپنی پوری زندگی مطالعہ کے لیے وقف کی۔ وہ پہلے ہی نحیف الجثہ تھے شب وروز کے مطالعے نے انہیں اور لاغر کردیا۔ جم کر بیٹھنے سے انہیں امراض معدہ نے گھیر لیا۔ کثرتِ تحریر سے ان

کے ہاتھ کمزور ہو گئے۔ سینے پر کتاب رکھ کر مطالعہ کرنے سے نشان پڑ گئے مگر وہ پڑھنے اور لکھنے میں کسی قسم کی کمی نہ کر سکے۔

دس ہزار نادر و کمیاب قلمی اور بخطِ مصنفین کتابوں کے ذخیرے کو یکجا کیا۔ یہ کتب خانہ آج بھی لکھنو کی آبرو اور علوم اسلامیہ کا بیش بہا خزانہ ہے۔ مولانا نے اس کتب خانے کے ساتھ اپنی اولاد کو اپنا کام بھی سونپا۔

وفات۔ ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ/ ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اپنے کتب خانے واقع محلہ کھجوہ لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔ وفات سے ایک دن پہلے تک تصنیف کا کام کرتے رہے تھے۔ وفات کے بعد جنازہ گھر لایا گیا اور پورے شہر کی مشایعت میں امام باڑہ غفران مآب میں سپردِ لحد کئے گئے۔ اور آپ کا لقب فردوس مآب مشہور ہوا۔

تصانیف

① استقصاء الافحام (فارسی مناظرہ۔ چاپ شد)

② شوارق النصوص (غیر مطبوعہ)

③ عبقات الانوار تحفہ اثناء عشریہ کے باب ہفتم میں جن حدیثوں کے ثبوت کو مسترد کیا گیا ہے عبقات ان حدیثوں کی سند، متن، مفہوم اور استدلال پر مفصل بحث کی جامع ہے۔ علامہ حامد حسین فردوس مآب نے حدیث ولایت، حدیثِ نور، حدیثِ طیر اور حدیثِ غدیر پر سات جلدیں لکھیں جو فارسی میں چھپ چکی ہیں۔

④ کشف المعضلات فی حل المشکلات (غیر مطبوعہ)

⑤ الدرد السنیہ فی المکاتیب ومنشات العربیہ (عربی، غیر مطبوعہ)

⑥ الغضب البتار فی مبحث آیۃ الغار، اس کا ایک عمدہ خطی نسخہ حاجی داؤد

لائبریری کراچی میں ہے۔
⑦ اسفار الانوار عن وقائع افضل الاسفار (عربی' فقہ غیر مطبوعہ)
⑧ افحام اہل المین فی ردِّ ازالۃ الغین
یہ ضخیم کتابیں دو دو تین تین جلدوں پر مشتمل ہیں اور کتب خانہ ناصریہ کھجوہ میں محفوظ ہیں۔

عبقات الانوار۔ دو اہم واقعے

جناب مولانا محمد حسین صاحب نے تذکرہ بے بہا میں رسالہ شیعہ کھجوہ بہار کے شمارہ مئی ۱۹۰۸ء اور جولائی ۱۹۰۸ء کے حوالے سے ایک واقعہ تو یہ لکھا ہے کہ کمشنر (؟) بہادر عبقات کا مطالعہ کرتے تھے۔ پشاور میں ملا عبدالحق ہاشمی اہل سنت کے عالم تھیان کو تحقیق حق کا شوق ہوا انتہائے شوق میں کشفِ حق کی دعا شروع کر دی ایک دن بعد نماز عشاء کنارۂ دریا جا کر سورہ مزمل کا عمل اور چلہ کشی آغاز کر دی۔ چالیسویں دن عمل کر کے وہیں لیٹ گئے۔ آنکھ لگی خواب دیکھا۔ ایک بزرگ صورت' سفید ریش' جو سید ولی اللہ معلوم ہوتے تھے۔ تشریف لائے اور فرمایا "اے عبدالحق' اگر حق کی تلاش ہے تو شیعوں کے مولوی سید حامد حسین کی مصنفات دیکھو۔ مثلِ آفتاب حق روشن ہو جائے گا" مولوی عبدالحق بیدار' اندھیری رات میں شہر کا رخ کیا اور حاجی ملک رحمان صاحب کے گھر پہنچے۔ ملک صاحب جاگے' باہر آئے اور ناوقت آنے کی وجہ پوچھی۔
مولوی صاحب نے معذرت کے بعد کہا: جناب۔ شیعہ عالموں میں کوئی سید حامد حسین بھی ہیں؟ حاجی صاحب نے فرمایا مولانا سید حامد حسین لکھنؤ میں علم و فضل میں بڑے بڑے عالموں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ فصاحت و

بلاغت میں سب سے کامل، انشاء پردازی میں اعلیٰ درجے کے منشی (انشا پرداز) درایت وعلم کلام میں بے مثل، محققین کے تو بادشاہ تھے۔ مختصر یہ کہ وہ آیت اللہ فی العالمین شیعوں کے رئیس اور شریعت کے سردار تھے۔ اب موجود نہیں؟ ملا صاحب نے پوچھا۔ ان کی کچھ تصنیفات ہیں؟ حاجی صاحب نے فرمایا مناظرہ میں ان کی بہت کتابیں ہیں۔ ملا صاحب نے کہا کوئی کتاب مجھے دیجئے کہ کچھ فائدہ اٹھاؤں۔ حاجی صاحب نے عبقات کی مجلد حدیث طیر دی وہ بہت شکر گذار ہوئے چند روز مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہوکر مذہب حق شیعہ اثناء عشری میں داخل ہو گئے۔ مولانا حامد حسین صاحب قبلہ فارسی و عربی کے صاحب کمال ادیب و مصنف، فقہ واصول کے بالغ نظر مجتہد، منطق و فلسفہ کے ماہر کی حیثیت سے ملک میں مرجعیت رکھتے تھے۔ سنی افاضل ان سے رجوع کرتے تھے عرب وعجم کے افاضل سے مراسلت تھی۔

آپ بڑے باوجاہت، امیری کی شان اور عالمانہ وقار سے رہے۔ آپ کی تہذیبی اور علمی روایت کو آپ بڑے فرزند نے کمال وعروج پر پہنچایا۔

اولاد۔ مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ۔ مولانا ذاکر حسین صاحب۔

تکملہ۔ ج ۱، ص ۲۴، بے بہا صفحہ ۱۳۳۔ نزہتہ الخواطر۔ تذکرہ ناصر ملت۔ الشہید خاص نمبر آگرہ (مارچ ۱۹۶۰) (ماخوذ از مطلع الانوار)

دیباچہ از مترجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمدؐ و آلہ الطاہرینؑ۔ واضح ہو کہ تقیہ ایسا ضروری اور فطری کام ہے جس کی عقل بھی تاکید کرتی ہے۔ شریعت بھی اس کا حکم دیتی ہے اور انبیاء کرام اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں مگر حضرات اہل سنت نے اس کو شیعوں کا مخصوص فعل کہہ کر ہمیں بدنام کرنا شروع کیا۔ اس وجہ سے علماء کرام و محققین عظام اس کی عقلی و نقلی خوبیاں دکھاتے رہے خصوصاً شمس العلماء الکرام، بدر الفقہا العظام، سلطان المحققین، صدر المتکلمین، حجتہ الاسلام والمسلمین آیۃ اللہ فی العالمین مولانا السید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے اس بحث میں جو بہت ہی مختصر رسالہ تحریر فرمایا ہے وہ جامع ترین خزانہ معلومات ہے جس میں قرآن مجید کی آیات، کتب تفسیر کی تحقیقات اور احادیث و تواریخ کے بیانات سے تقیہ کی ضرورت اور اجازت ایسی تشفی بخش صورت سے جمع فرمادی ہے کہ پھر کسی انصاف پسند بلکہ صاحب عقل کو اس کے متعلق ذرہ برابر شبہ یا تردد نہیں ہوسکتا۔ جناب والدِ ماجد مولانا السید علی حیدر صاحب قبلہ مدیر رسالہ اصلاح کھجوا دام ظلہ نے مجھ سے فرمایا کہ تو اس کا اردو ترجمہ کردے۔ لہذا مجھے تعمیل حکم کرنی پڑی۔ خدا اس کو غلطیوں سے محفوظ رکھے اور مومنین و مسلمین کو اس کا پورا نفع حاصل ہو۔ اس ترجمہ میں اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جن کتابوں کی عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی جلد اور صفحہ کا نشان بھی لکھ دیا جائے تاکہ اصل کتاب سے کسی عبارت کے ملانے کا موقع ملے تو کوئی دقت نہ پیش آئے۔ اور بعض مقامات پر کچھ عبارتیں حاشیہ میں

بھی بڑھادی گئی ہیں تا کہ اردو داں حضرات اس کتاب سے اچھی طرح مستفید ہوسکیں۔ اور یقین کریں کہ شیعوں کے کل عقائد اور فقہی مسائل صرف خدا و رسولؐ ہی کے بتائے ہوئے ہیں۔ ایک مسئلہ بھی اس اصول کے خلاف نہیں مل سکتا۔

احقر سید محمد باقر کھجوئی
متعلم مدرسہ ایمانیہ بنارس

تمہیدی کلمات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انعم واولی۔ واحسن و اسدی۔ واکرم من عبادہ من ھو اتقی۔ والسلام الازکی الابھی۔ علی نبیہ المصطفی۔ وآلہ الکرام الذین ھم اعلام الھدی والعروۃ الوثقی وآئمۃ اھل التقی۔ والمتسمنون ذروۃ العلی۔ لاسیما علی اخیہ وصھرہ الذی صبر علی حیف آئمۃ الھوی۔ وفی العین قذی۔ وفی الخلق شجی۔

حمد ونعت کے بعد ناظرین کتاب پر واضح ہو کہ بعض علمائے اہل سنت نے بحثِ تقیہ وافعال العباد۔ ومسئلہ امامت کے بارے میں کچھ سوالات جناب افضل العلماء المتکلمین واکمل الفقہاء والمجتہدین مولانا ومولی المومنین ۔ وحید الدہر فرید ال آوان ۔ مجتہد العصر والزمان ۔ ذی المفاخر البہیہ والمآثر السنیہ ۔ المسدد بتائید الصمد مولانا السید محمد ادام اللہ معالیہ وابا اعادیہ کے پاس بھیجے تھے۔ وہ ہماری نظر سے بھی گذرے ۔ ہمکو مناسب معلوم ہوا کہ ہمارے علمائے اعلام کی کتابوں اور تحقیقی ذخیروں میں ان اعتراضاف کے محققانہ اور تسلی بخش جوابات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں ان کو مختصر کر کے بطور خلاصہ یہاں درج کردیں۔ اس ضروری خدمت میں خدا اپنی توفیق ہمارے شامل حال کرے کہ اسی سے ہم اعانت کے خواستگار ہیں۔

پہلے ہم قرآن مجید اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور اقوال و افعال اور علماء کرام کے بیانات سے ان چیزوں کو لکھتے ہیں جن سے تقیہ کا جائز ہونا مثلِ آفتاب ظاہر و روشن ہوجاتا ہے اس کے بعد علماء اہل سنت کے اعتراضات کی طرف توجہ کریں گے۔

قرآن سے تقیہ کی دلیلیں

وہ آیتیں جن سے تقیہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

پہلی آیت: خدا کا یہ ارشاد ہے کہ: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ۔ (پارہ ۳۔ آل عمران۔ آیت ۲۸) یعنی مومنین کو چاہیے کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔ مگر اس تدبیر سے کسی طرح پر ان سے بچنا چاہو تو خیر۔ (پارہ ۳ رکوع ۱ سورہ آل عمران رکوع ۳)۔ اس آیہ کی تفسیر میں علامہ بیضاوی نے لکھا ہے:

"لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء۔ نهوا عن موالاتهم بقرابة بینهم او صداقة جاهلية ونحوها حتى لایکون حبهم و بغضهم الا فی الله او عن الاستعانة بهم فی الغذو سائه الامور الدینیة من دون المومنین اشارة الى انهم احقاء بالموالاة وان فی موالاتهم مندوحة عن موالاة الکفرة و من یفعل ذلك ای اتخاذهم اولیاء فلیس من الله فی شئی من ولایته و یصح ان یسمّی ولایة فان موالاة المتعادیین لا یجتمعان۔ قال ... تودّ عدوی ثم تزعم اننی صدیقك لیس النوك عنك بعاذب۔ الا ان تتقوا منهم الا ان تخافوا من جهتهم مایجب اتقائه والفعل متعدی بمن لانه فی معنی تحذروا او تخافوا۔ تقاة وقوع یعقوب تقیه۔ منع عن موالاتهم ظاهر اور باطنه فی الاوقات کلها الاوقت المخافة فان اظهار الموالاة حینئذ جائز کما قال عیسی علیه السلام کن وسطاً امش جانبا انتهی"

یعنی مومنین کو چاہیے کہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ اس آیۃ میں مومنین کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی سابق رشتہ داری یا زمانہ جاہلیت کی محبت والفت وغیرہ کی وجہ سے اب بھی ان کافروں سے دوستی قائم رکھیں تا کہ ان کی دوستی بھی خدا ہی کی راہ میں ہو اور دشمنی بھی خدا ہی کی راہ میں۔ یا اس آیۃ کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کو لڑائیوں اور دوسرے دنیوی کاموں میں کافروں سے مدد لینے کو منع کیا گیا ہے بس اس قسم کے جو کچھ تعلقات رکھنے ہوں وہ صرف مومنین ہی سے رکھیں۔ اس جملہ سے خدا نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مومنین ہی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے دوستی کا برتاؤ کیا جائے اور یہ کہ ان سے دوستی کرنا کافی ہے جس کے بعد کافروں سے دوستی کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوسکتی۔ اور جو ایسا کرے یعنی خدا کے منع کرنے کے بعد بھی وہ کافروں کو اپنا دوست بنائے تو اس کو اللہ سے کوئی سروکار نہیں یعنی معلوم ہوگا کہ وہ خدا کو دوست نہیں رکھتا اور نہ خود خدا کی دوستی چاہتا ہے۔ اگر وہ خدا کا دوست ہے بھی تو اس کو دوست کہنا درست نہیں ہوگا کیونکہ دو دشمنوں کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتی (کہ کافر تو خدا کے دشمن ہیں پھر جو شخص کافروں کو بھی دوست رکھے اور خدا کو بھی دوست رکھے وہ دو دشمنوں کی دوستی کا دعوی کرتا ہے جو ہو نہیں سکتا) چنانچہ شاعر نے اس کو کہہ بھی دیا ہے کہ اے شخص تو میرے دشمن کو دوست رکھتا ہے پھر مجھ سے کہتا ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں یہ کیسی بے عقلی کی بات ہے۔ (اس کے بعد خدا نے فرمایا ہے کہ) مگر یہ کہ ان کافروں سے بچنا چاہو یعنی ان سے تمہیں کسی ایسی بات کا خوف ہو جس سے بچنا واجب ہو (تب ان سے ضرور دوستی کرلو) اور یہ فعل حرف ''من'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم لوگ ان (کافروں) سے ڈرو یا خوف کرو۔

اس کے بعد خدا نے فرمایا ہے "تقاتا" مگر امام یعقوب کی قرآت میں یہ لفظ "تقیۃ" ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہر وقت یعنی ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی کافروں کی دوستی سے بچیں سوائے خوف کے وقت کے۔ کیونکہ جب کافروں سے کسی بات کا ڈر ہو تو اس وقت ان سے دوستی ظاہر کرنا جائز ہے۔ جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ وسط میں رہو اور کنارے ہو کر چلو یعنی ظاہر تو یہ کرو کہ تم ان ہی لوگوں کے درمیان ہو مگر اپنی روش الگ رکھو۔ اس طرح وہ لوگ تم کو اپنے میں سمجھیں گے بھی اور تم ان کے مذہب میں شامل بھی نہ ہو گے۔ انتہی (تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر جلد ا۔ ص ۱۱۲)

اور امام بخاری نے لکھا ہے "وقال الا ان تتقوا منهم تقاة وهی تقیة" یعنی خدا نے جو فرمایا ہے کہ اگر کافروں سے ڈر ہو تو ان سے بچنے کے لیے دوستی کرلو۔ اس میں تقاۃ کا مطلب تقیہ ہے کہ تم لوگ تقیہ کرلیا کرو (صحیح بخاری کتاب الاکراہ پارہ ۲۸ مطبوعہ دہلی ص ۱۰۲۵) اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس جملہ کی شرح میں لکھا ہے کہ:

اخذه من کلام ابی عبیدة قال تقاة و تقیه واحدة۔ و معنی الآیة لا یتخذ المومن الکافر ولیا فی الباطن ولا فی الظاهر الا للتقیة فی الظاهر فیجوز ان یوالیه اذا اخافه و یعاویه باطنا۔ قیل الحکمة فی العدول عن الخطاب ان موالاة الکفار لما کانت مستقبحة لم یواجه الله المومنین بالخطاب قلت و یظهر لی ان الحکمة فیه انه لما تقدم الخطاب فی قوله تعالی لاتتخذ الیهود و النصاری اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم۔ کانهم اخذوا البعموم حتی انکر و اعلی من کان له عذر فی ذلك

منزلت هذه الآية رخصة فی ذلك وهو كالآيات الصريحة فی الزجر
عن الكفر بعد الايمان ثم رخص فيه لمن اكره على ذلك۔

یعنی امام بخاری نے جو قرآن مجید کے لفظ تقاۃً کی تفسیر ''تقیہ'' کی تو اس کو انہوں نے امام فن ابوعبیدہ کے قول سے اختیار کیا ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ تقاۃ اور تقیہ دونوں ایک ہی ہیں اور آیہ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مومن کسی کافر کو اپنا دوست نہ بنائے۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔ ہاں اگر بظاہر تقیہ کرنا ہو کہ اگر اس کافر کی دوستی ظاہر نہ کی جائے تو اس سے کسی قسم کا خوف ہوگا تو جائز ہے کہ ظاہراً اس کی دوستی کا اقرار کیا جائے اور دل میں اس کی دشمنی ہی رہے۔ یہاں یہ سوال ہوا کہ خدا نے اس آیت میں مومنین سے خطاب کر کے یہ بات کیوں نہیں فرمائی (یعنی خدا نے کیوں اس طرح کہا کہ مومنین کسی کافر کو دوست نہ بنائیں ۔ اور اس طرح کیوں نہ کہا کہ اے مومنین کسی کافر کو تم دوست نہ بنانا) تو بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ کافروں کی دوستی چونکہ بہت بری چیز ہے اس وجہ سے خدا نے مومنین کو خود مخاطب کر کے یہ بات کہنا پسند نہیں کی۔ اور میرے (علامہ ابن حجر کے) خیال میں اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ پہلے خدا مومنین کو خطاب کر کے انہیں یہ بات فرما چکا تھا کہ تم لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بنانا یہ لوگ تمہاری مخالفت میں باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے کوئی شخص ان کو دوست بنائے گا تو بے شک وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ (پارہ ۶ رکوع ۱۲) اس پر ان مومنین نے گویا عام طور سے کافروں کی دوستی چھوڑ دی یہاں تک کہ جو شخص کسی مجبوری یا دباؤ سے کسی کافر سے دوستی ظاہر کرتا تھا اس پر بھی لوگ اعتراض کرنے لگتے تھے۔ اس وجہ سے اس آیہ تقیہ کو نازل فرمایا جس میں اس بات کی اجازت دی

کہ اگر کسی کافر سے کسی مومن کو ڈر ہو تو اس کو اجازت ہے کہ تقیہ کرے یعنی اس کافر کی دوستی کا اظہار کرے۔ پس یہ آیت گویا ان صریحی آیتوں سے ہے جن میں لوگوں کو تاکید کی گئی ہے کہ ایمان لانے کے بعد کافروں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں ہاں جو اس قسم کی باتوں پر مجبور کیا جائے تو اس کی اجازت دے دی گئی کہ تقیہ کر کے اس تعلق کو ظاہر کرے۔ انتہی (فتح الباری شرح صحیح بخاری مطبوعہ دہلی پارہ ۲۸ ص ۴۵۰)۔ اور علامہ زمخشری نے اس آیہ کی تفسیر میں لکھا ہے:

"رخص لهم في موالاتهم اذا خافوهم والمراد تبلك الموالاة مخالفة ومعاشرة ظاهرة والقلب مطمئن بالعداوة والبغضاء و انتظار زوال المانع من قشر العصى كقول عيسى صلوة الله عليه كن وسطا وامش جانبا"

یعنی خدا نے اس آیہ تقیہ سے مومنین کو اجازت دے دی کہ جن کافروں سے کسی بات کا ڈر ہو تو ان سے دوستی ظاہر کر دیں مگر اس دوستی ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ظاہری طور پر ان سے اچھا برتاؤ، میل جول اور عمدہ اخلاق برتیں۔ لیکن دل میں ان کی پوری عداوت اور ان سے شدید نفرت ہی ہو بلکہ باطن میں یہ انتظار ہو کہ اس کافر کا دباؤ ہٹے تو ہم اپنی دوستی کا اظہار بھی موقوف کر دیں بلکہ اس کی دشمنی کا اقرار کر لیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ وعلی نبینا نے فرمایا کہ رہو تو دشمنوں کے درمیان ہی میں (جس سے وہ لوگ تم کو بھی اپنے ہی میں سمجھیں مگر اپنی رفتار ان سے الگ رکھو (کہ ان کے مذہب کا کوئی کام نہ کرو بلکہ اپنا کام اپنے طور پر انجام دیتے رہو) انتہی (تفسیر کشاف مطبوعہ مصر جلد ا ص ۳۰۰) اس صاف اور صریح بیان سے تقیہ کا جائز ہونا اچھی طرح واضح ہو گیا کہ کفار کی دوستی حرام ہے مگر جب ان کافروں سے کوئی خوف ہو تو

مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ اس حرام کام کو کریں اور کافروں کے دوست بن جائیں تا کہ ان کے ظلم یا سختی سے محفوظ رہیں۔ باوجود ان تصریحات کے حضرات اہل سنت کے پیشوا جناب ملا یعقوب صاحب نے شرح تہذیب میں جو تقیہ کو نفاق کہا ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ خدا ہی نے نفاق کو جائز رکھا ہے۔ ا

دوسری آیۃ۔ خدا نے ارشاد فرمایا: إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿۱۰۵﴾ مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۶﴾ (سورہ نحل)

ا۔ حضرت مصنف علام اعلی اللہ دارالسلام نے اس آیت کے متعلق صرف دو تفسیری کتابوں کی عبارتیں نقل فرمائیں مگر اردو داں جماعت کی مزید اطلاع کے لیے ہم بعض اور کتابوں کی عبارتیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔ علامہ محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے "الا ان تتقوا منهم تقاة الا ان تكونوا في سلطانهم فتخافوهم على انفسكم فتظهروا لهم الولاية بالسنتكم و تضمروا لهم العداوة و لا تتابعوهم على ما هم عليه من الكفر و لا تعينوهم على مسلم بفعل" یعنی خدا نے جو فرمایا ہے کہ ان سے تقیہ کے طور پر دوستی کر سکتے ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مومن کسی کافر کی حکومت یا دباؤ میں ہو اور اس سے ڈرے تو اس مومن کو حکم ہے کہ اپنی زبان سے اس کافر کی محبت ظاہر کر دے مگر دل میں اس کی عداوت ہی چھپائے رکھے۔ کافر کے کسی مذہبی کام میں دل سے شریک نہ ہو اور نہ کسی مسلمان کے خلاف انکی واقعی مدد کرے۔ "عن ابن عباس قوله لا يتخذ المومنون الكافرين اولياء من دون المومنين قال نهى الله سبحانه المومنين ان يلاطفوا الكفار و يتخذوهم وليجة من دون المومنين الا ان يكون الكفار عليهم ظاهرين فيظهروا لهم اللطف "۔ یعنی حضرت ابن عباس نے اس آیۃ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ خدا نے مومنین کو حکم دیا کہ کفار کے ساتھ محبت اور میل جول نہ رکھا کریں نہ ان کو اپنا دوست بنائیں ہاں اگر کافروں کا زور ہو تو (اپنی حفاظت کے لیے) مومنین ان کی محبت اور لطف و مدارات کو ظاہر کریں۔ "الا ان تتقوا منهم تقاة فهو يظهر الولاية لهم في دينهم۔ البراءة من المومنين"۔ یعنی ان کفار سے تقیہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مذہبی باتوں میں ان کافروں سے اتفاق و اتحاد اور مومنین سے علیحدگی ظاہر کی جائے۔ "التقيه باللسان من حمل على ام يتكلم به و هو لله معصية فتكلم مخافة على نفسه و قلبه مطمئن بالايمان فلا اثم عليه انما التقية باللسان"۔ یعنی تقیہ زبان سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ اگر کوئی شخص ایسی بات کہنے پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے سے خدا کا گناہگار ہو مگر وہ شخص اپنی جان کے ڈر سے وہ بات کہہ دے لیکن اس کے دل میں ایمان پوری طرح موجود ہو تو اس طرح تقیہ کرنے سے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ زبان سے تو تقیہ کرنے کا حکم ہی دیا گیا ہے (تفسیر طبری مطبوعہ مصر جلد ۳ ص ۱۴۰) اور علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے "فالمعنى ان تخافوا من جهتهم امر ايجب اتقاؤه رخص لهم في موالاتهم اذا خافوهم" یعنی اس آیۃ کا مطلب یہ ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم۔ یعنی دل سے جھوٹ بنانا تو ان ہی لوگوں کا کام ہے جن کو خدا کی آیتوں کا یقین نہیں اور اصل میں یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو اس سے کچھ مواخذہ نہیں لیکن جو شخص ایمان لائے پیچھے خدا کے ساتھ کفر کرے اور کفر بھی کرے تو جی کھول کر تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے (پارہ ۱۴۔ رکوع ۲۰)۔ علامہ قاضی بیضاوی نے اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ "روی ان قریشا اکرمو عمارًا و ابویہ یاسرًا و سمیّۃ علی الارتداد او فربطوا سمیّۃ بین بعیرین ووجی بحربۃٍ فی قبلھاء قالوا انک اسلمت من اجل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱)

کہ اگر مومنین کو کفار سے کسی ایسی بات کا خوف ہو جس سے بچنا ضروری ہے تو خدا نے ان کو اجازت دی ہے کہ ایسے خوف کی حالت میں کافروں کی دوستی اختیار کر لیں (تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ تفسیر طبری جلد ۳ ص ۱۷۳) اور علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے "ان التقیہ انما تجوز اذا کان الرجل فی قوم کفار ویخاف منھم علی نفسہ و مالہ فیھ اریھم باللسان۔" یعنی تقیہ اس وقت جائز ہے جب کوئی شخص کافروں کی قوم میں ہو اور ان سے اپنی جان و مال کے بارے میں ڈرے تو اپنی زبان سے ایسی بات کہہ دے جس سے وہ لوگ اس سے خوش رہیں۔ "التقیۃ جائزۃ لصون النفس وھل ھی جائزۃ لصون المال یحتمل ان یحکم فیھا بالجواز لقولہ من قتل دون مالہ فھو شھید ولان الحاجۃ الی المال شدیدۃ۔" یعنی اپنی جان بچانے کے لیے تو تقیہ جائز ہی ہے لیکن کیا مال بچانے کے لیے بھی تقیہ جائز ہے؟ احتمال ہے کہ ہاں مال بچانے کے لیے بھی یہ جائز ہے کیونکہ حضرت رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے کہ مسلمان کے مال کی عزت بھی اس کے خون کی عزت کے برابر ہے۔ اور یہ بھی حضرت نے فرمایا کہ جو شخص اپنا مال بچانے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے اور مال کی حاجت سخت بھی ہوتی ہے۔ "وروی عوف عن الحسن انہ قال التقیۃ جائزۃ للمومنین الی یوم القیامۃ وھذا القول اولی لان دفع الضرر عن النفس واجب بقدر الامکان"

یعنی عوف نے امام حسن بصری سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے تھے تقیہ تو مومنین کے لیے قیامت تک جائز ہے اور یہی قول بہتر ہے کیونکہ اپنے نفس سے ضرر کا امکان بھر دور کرنا اور دور رکھنا واجب ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۶۴۶) اور علامہ خازن نے لکھا ہے "ان اللہ نھی المومنین عن موالاۃ الکفار و مداھنتھم و مباطنتھم الا ان یکون الکفار غالبین ظاھرین او یکون المومن فی قوم کفار فیداھنھم بلسانہ و قلبہ مطمئن بالایمان دفعا لنفسہ" یعنی خدا نے مومنوں کو کافروں کے ساتھ دوستی، رازداری، محبت، میل جول وغیرہ کے تعلقات قائم کرنے سے منع کیا ہے مگر اس صورت میں کہ کفار کا زور دار اور غلبہ ہو یا مومن کافروں کی قوم میں ہو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳ پر)

الرجال فقلت وقتلوا یاسرا وهما اول قتیلین فی الاسلام واعطاهم عمار بلسانه ما ارادوا مکرها۔ فقیل یا رسول الله ان عمارا کفر۔ فقال کلا ان عمارا ملئی ایمانا من قرنه الی قدمه واختلط الایمان بلحمه و دمه۔ فاتی عمار رسول الله وهو یبکی فجعل رسوال الله یمسح عینیه و قال مالك۔ ان عادوا فعدلهم بما قلت۔ وهو دلیل علی جواز التکلم بالکفر عندالاکراه۔ انتهی۔ یعنی لوگوں نے بیان کیا ہے کہ قریش کے کفار نے حضرت عمار اور ان کے باپ یاسر اور ماں سمیہ کو دین اسلام سے پھر جانے پر مجبور کر دیا۔

ان کی ماں سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ایک برچھے سے ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲)

کہ ان صورتوں میں مومنوں کو چاہیے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے کفار کے ساتھ اپنی زبان سے میل جول کا برتاؤ کریں مگر دل میں پورا پورا ایمان رہنا چاہیے۔ "انما تجوز التقیة لصون النفس عن الضرر لان دفع الضرر عن النفس واجب بقدر الامکان" یعنی تقیہ اس لیے جائز کیا گیا ہے کہ اپنی جان کو نقصان سے بچایا جائے کیونکہ جان کو نقصان سے امکان بھر بچانا واجب ہے۔ (تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۲۲۷) اور علامہ نسفی نے لکھا ہے "الا ان تخافوا من جهتهم امرا یجب اتقاؤه ای الا ان یکون للکافر علیک سلطان فتخافه علی نفسک و مالک فحینئذ یجوز لک اظهار الموالاة وبطان المعاداة" یعنی اگر تم کو کافروں سے کسی ایسی بات کا ڈر ہو جس سے بچنا واجب ہو یعنی کافروں کو تم پر غلبہ یا زور ہو جس سے تمہیں خوف ہو کہ وہ تمہیں یا تمہارے مال کو کسی طرح نقصان پہنچا دیں گے تو ایسی صورت میں جائز ہے کہ ان کافروں کی دوستی کا اظہار کرو اور دل میں ان کی دشمنی کو چھپائے رہو۔ (تفسیر مدارک جلد ۱ ص ۲۲۷)۔ علامہ سیوطی نے بھی مذکورہ بالا حدیثوں کو لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر در منثور جلد ۱ ص ۱۶)۔ علامہ بغوی نے بھی ان حدیثوں کو لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر معالم التنزیل مطبوعہ بمبئی ص ۱۵۳) اور جناب نواب مولوی صدیق حسن خان صاحب بھوپالی نے لکھا ہے "فی ذلک دلیل علی جواز الموالاة لهم مع الخوف منهم ولکنها تکون ظاهرا لا باطنا" یعنی اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب کافروں سے کسی بات کا ڈر ہو تو ان سے دوستی اور موافقت کرنا جائز ہے لیکن یہ موافقت صرف ظاہری طور پر ہوگی دل سے نہیں۔ اس کے بعد تقیہ کے جائز ہونے کی وہ کل حدیثیں جو پہلے لکھی گئیں موصوف نے بھی جمع کر دی ہیں یہ بھی فرما دیا ہے "التقیة جائزة الی یوم القیامة" یعنی تقیہ قیامت تک جائز ہے (تفسیر فتح البیان جلد ۲ ص ۳۰) اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "من خاف فی بعض البلدان والاوقات من شرهم فله ان یتقیهم بظاهره لا بباطنه و نیته" یعنی کسی شہر میں یا کسی وقت کوئی شخص کافروں کی شرارت سے ڈرے تو اس کو حکم ہے کہ ظاہری طور پر ان کافروں کی موافقت کر کے اپنے کو بچا لے مگر دل اور نیت میں ان کافروں کی موافقت نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۲۱۷) ۱۲ مترجم

آگے کے اندام نہانی میں مارنا شروع کیا اور ان سے کہتے تھے کہ تو نے مردوں کی وجہ سے اسلام قبول کرلیا۔ یہاں تک کہ وہ بیچاری اسی عذاب میں شہید ہو گئیں۔ پھر ان لوگوں نے حضرت عمارؓ کے باپ یاسر کو بھی شہید کر ڈالا۔ اسلام میں یہی دونوں بزرگ سب سے پہلے شہید ہیں۔ اور حضرت عمارؓ نے ان لوگوں کے ظلم اور اذیت سے مجبور ہو کر زبان سے کفر کی وہ بات کہہ دی جو کفار ان سے کہلانا چاہتے تھے۔ اس کی خبر لوگوں نے حضرت رسول خدا ﷺ تک پہنچا دی اور کہا کہ یا حضرت عمارؓ تو کافر ہو گئے۔ مگر حضرت ﷺ نے ان کو جھڑک کر فرمایا ہرگز نہیں۔ بلکہ عمارؓ تو اپنے سر سے پاؤں تک ایمان میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ایمان ان کے گوشت کے ایک ایک جزو اور خون کے ایک ایک قطرے میں سرایت کئے ہوئے ہے (پھر وہ کیسے کافر ہو سکتے ہیں؟) اس کے بعد ہی حضرت عمار بھی جناب رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ تو رسول خدا ﷺ اپنے ہاتھوں سے ان کی دونوں آنکھوں کے آنسو پونچھتے جاتے اور ارشاد فرماتے تھے عمار تم اس طرح روتے کیوں ہو؟ تمہارا نقصان ہی کیا ہوا ہے۔ اگر کفار تم سے پھر وہی بات کہلانی چاہیں تو تم پھر اسی طرح کہہ دینا۔ حضرت کا یہ عمل اور یہ ارشاد اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص مجبور کر دیا جائے تو کفر بات زبان سے بول دینا اس کے لیے جائز ہے (تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۳۹۶) اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس آیۃ کی تفسیر کے موقع پر لکھا ہے:

"ھو وعید شدید لمن ارتد مختارا۔ واما من اکرہ علی ذلک فھو معذور بالآیۃ لان الاستثناء من الاثبات نفی فیقتضی ان لا یدخل الذی اکرہ علے الکفر تحت الوعید والمشھور ان الآیۃ

المذكورة نزلت في عمار بن ياسر كما جاء من طريق ابي عبيدة
ابن محمد ابن عمار ابن ياسر قال اخذ المشركون عمارا فعذبوه
حتى قاربهم في بعض ما ارادوا فشكى ذلك الى النبي ﷺ فقال له
كيف تجده قلبك. فقال مطمئن بالايمان. قال فان عادوا
فعدوهو مرسل رجاله ثقات"

یعنی جو شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی جبر یا دباؤ کے دین اسلام سے پھر کر مرتد ہوجائے اس کے لیے یہ آیۃ سخت دھمکی ہے۔ البتہ جو شخص مجبور کردیا جائے اور اس سے زبردستی ایسی بات کہلا دی جائے (جو اس کے مذہب کے خلاف ہو) اس آیۃ سے وہ شخص معذور قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ کوئی حکم دینے کے بعد اس سے جو استثناء کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے لئے وہ حکم نہیں ہے۔ پس اس آیت کا بھی نتیجہ یہ ہے کہ اس دھمکی میں وہ شخص نہیں آئے گا جو کفر کی بات ظاہر کردینے پر مجبور کردیا جائے اور اس سے اس قسم کا کلام زبردستی کہلایا جائے۔ اور مشہور یہ ہے کہ یہ آیۃ حضرت عمارؓ بن یاسر صحابی کی شان میں نازل ہوئی جیسا کہ ابوعبیدہ ابن محمد بن عمار بن یاسر کی روایت میں ہے کہ قریش کے کافروں نے حضرت عمار کو گرفتار کرکے ان پر بڑے سخت سخت ظلم کئے یہاں تک کہ اُس بیچارے نے مجبور ہوکر تقریباً وہ سب باتیں کہہ دیں جو وہ کافر اُس سے کہلانی چاہتے تھے۔ اس کے بعد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر انہوں نے اپنی مصیبت کی شکایت کی۔ تو حضرتؐ نے ان سے فرمایا کہ تم اپنا دل کیسا پاتے ہو؟ عمارؓ نے کہا میرا دل تو ایمان کی طرف سے پورا پورا مطمئن ہے۔ تب حضرتؐ نے فرمایا پھر (کچھ پرواہ نہیں بلکہ) اگر وہ دوبارہ یہی بات کہلائیں تو تم اسی طرح اب بھی کہہ دینا۔ یہ روایت مرسل ہے اور اس کے راوی سب معتبر

ہیں (فتح الباری پارہ ۲۸ ص ۵۰ ۴ مطبوعہ دہلی) اس کے بعد علامہ ابن حجر نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ کافروں نے حضرت خباب و بلال و عمار کو گرفتار کر کے کفر کی باتیں کہلانی چاہیں اور حضرت عمار نے وہ باتیں کہہ دیں مگر دوسرے لوگوں نے نہیں کہیں۔ یہ لکھ کر وہ تحریر کرتے ہیں:

"واخرجه انها کهی من مرسل زید بن اسلم وان ذلك وقع من عمار عند بیعة الانصار فی العقبة فان الکفار اخذ ا عمارا فسالوا عن النبیؐ فجحدهم خبره فارادوا ان یعذبوه فقال هو یکفر بمحمد وبما جاء به فاعجبهم واطلقوه۔ فجاء الی النبیؐ فذ کر نحوه فی سنده ضعف ایضا۔ و اخرج عبد ابن حمید من طریق ابن سیرین ان رسول اللهؐ لقی عمار بن یاسر وهو یبکی فجعل یمسح الدموع عنه و یقول اخذك المشرکون فغطوك فی الماء حتی قلت لهم کذا۔ ان عادوا فعد۔ ورجاله ثقات مع ارساله ایضا و هذه المراسیل یقوی بعضها ببعض"

یعنی اس واقعہ کو فاکہی نے زید بن اسلم کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے اور یہ بات حضرت عمارؓ سے اس وقت واقع ہوئی جب عقبہ میں انصار حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرتے تھے کہ اسی حال میں کافروں نے حضرت عمارؓ کو گرفتار کر لیا اور ان سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پوچھنے لگے جناب عمار نے ان لوگوں سے آنحضرتؐ کی کوئی بات نہیں کہی تو ان لوگوں نے آپ کو ستانا چاہا۔ اس پر وہ بولے کہ میں تو نہ محمد کو مانتا ہوں نہ ان کے مذہب پر ہوں۔ اس سے وہ کافر خوش ہو گئے اور عمار کو چھوڑ دیا جس کے بعد وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کو ذکر کیا۔ تو حضرتؐ نے وہی فرمایا جو اوپر

لکھا گیا۔ اس روایت کی سند میں بھی ضعف ہے۔ اور عبد ابن حمید نے ابن سیرین کے طریق سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمار یاسرؓ کی ملاقات ہوگئی جو اس وقت روتے تھے تو حضرتؐ ان کی آنکھوں سے آنسو پوچھنے لگے۔ اور فرماتے تھے کیوں عمار کافروں نے تم کو گرفتار کر کے پانی میں ڈبو دیا تھا جس پر تم نے ان کے موافق فلاں فلاں بات کہہ دی۔ دیکھو اگر وہ پھر ایسی ہی زبردستی کریں تو تم بھی یہ باتیں اسی طرح کہہ دینا۔ اس روایت کے راوی سب معتبر ہیں اور اگرچہ یہ روایت بھی مرسل ہے مگر یہ کئی مرسل روایتیں مل کر ایک دوسری کو قوی کر دیتی ہیں۔

اس کے تھوڑے فاصلہ کے بعد علامہ ممدوح نے پھر یہ لکھا ہے:

"واخرج الطبری من طریق علی ابن طلحه عن ابن عباس فی قوله الا من اکراه و قلبه مطمئن بالایمان قال اخبر الله انه من کفر بعد ایمانه فعلیه غضب من الله۔ فاما من اکره بلسانه و خالف قلبه اللسان لینجو بذلك من عدوه فلا حرج علیه ان الله انما یاخذ العباد بما عقدت علیه قلوبهم"

یعنی طبری نے علی ابن طلحہ کے طریق سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ وہ اس آیہ الا من اکراہ و قلبہ مطمئن بالایمان (جو شخص مجبور کر دیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو) کے متعلق فرماتے تھے کہ خدا نے اس آیۃ میں اس بات کی خبر دی ہے کہ جو شخص ایمان قبول کرنے کے بعد کافر اور مرتد ہو جائیگا اس پر اللہ کا سخت غضب ہوگا۔ البتہ وہ شخص جو مجبور کر دیا جائے اور اس کی زبان سے زبردستی کفر کی باتیں کہلا دی جائیں مگر اس کا دل اس کی زبان کے خلاف ہو یعنی وہ شخص صرف اپنے

دشمن کے ظلم سے بچنے کے لیے کفر کی بات محض زبان سے کہہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ خدا تو بندوں سے صرف ان ہی باتوں کا مواخذہ کرے گا جن کا وہ دل سے اعتقاد رکھتے ہیں۔ (فتح الباری پارہ ۲۸ ص ۲۵۰)

اور علامہ زمخشری نے اس آیۃ کی تفسیر میں لکھا ہے المعنی انما یفتری الکذب من کفر باللہ من بعد ایمانہ واستثنی منہ المکرہ فلم یدخل تحت حکم الافتراء یعنی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں دل سے جھوٹ بنانا تو انہیں کا کام ہے جو اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیتے ہیں مگر ان لوگوں سے وہ لوگ مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں جو اپنے عقیدے کے خلاف زبان سے کوئی بات کہنے کے لیے مجبور کر دیئے جائیں کہ وہ افتراء کے حکم میں داخل نہیں ہیں۔ (تفسیر کشاف مطبوعہ مصر جلد ۳ ص ۱۷۶)[۱]

---

[۱] یہ آیۃ بھی تقیہ کے جائز ہونے کی بہت زبردست دلیل ہے۔ حضرت مصنف علام اعلے اللہ مقامہ نے اس کے متعلق چند تفسیروں کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ہم کچھ اور کتابوں کی عبارتیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔ علامہ بغوی نے یہ کل واقعات لکھے ہیں جو علامہ بیضاوی و علامہ ابن حجر نے لکھے اور جو اوپر نقل کیے گئے (ملاحظہ ہو تفسیر معالم التنزیل مطبوعہ بمبئی ص ۵۲۱) اور علامہ طبری نے بھی اس مضمون کی بہت سی روایتیں لکھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر جامع البیان مطبوعہ مصر جلد ۱۴ ص ۱۱۲) علامہ نیشاپوری نے بھی ان روایتوں کو لکھا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے فمن ھنا حکم العلماء بان الاکراہ یجوز التلفظ بکلمۃ الکفر۔ وحد الاکراہ ان یعذبہ بعذاب لا طاقۃ لہ بہ کالتخویف بالقتل والضرب الشدید وسائر الایلامات القویہ واجمعوا علی ان قلبہ عند ذلک یجب ان یکون معرضا عن الرضا بالکفر۔ یعنی اس آیۃ سے علماء نے یہ حکم دیا ہے کہ زبردستی یا مجبوری کی حالت میں کفر کا کلمہ کہہ دینا جائز ہے اور زبردستی و مجبوری کی حد یہ ہے کہ اس شخص پر ایسی سختی کی جائے جس کے برداشت کی طاقت اس میں نہ ہو۔ مثلاً اس کو قتل کی دھمکی دے یا سخت مار کا خوف دلائے یا اور صورتوں سے ستائے۔ اور علماء نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ ایسی زبردستی اور مجبوری کی حالت میں چاہیے کہ جس شخص پر زبردستی کی جائے اس کا دل کفر کی بات کہنے پر راضی نہ ہو بلکہ اس کو نہایت کراہت اور بے بسی میں کہے۔ (تفسیر غرائب القرآن جلد ۱۴ ص ۱۱۸) اور علامہ خازن نے بھی اس آیت کی تفسیر میں ان روایتوں کو جو جناب عمار وغیرہ کے متعلق ہیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ان الایۃ عامۃ فی کل من اکرہ علی الکفر وقلبہ مطمئن بالایمان وان کان السبب خاصا یعنی یہ آیت عام ہے ہر اس شخص کے متعلق جو کفر بولنے یا قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے پورا پورا مطمئن ہو اگرچہ اس کا سبب کوئی خاص بات ہی ہو (تفسیر خازن جلد ۳ ص ۱۳۶) علامہ نسفی نے بھی ان کل باتوں کو لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر مدارک التنزیل جلد ۳ ص ۱۳۷) اور علامہ ابن کثیر نے اس آیہ کے متعلق لکھا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹ پر)

تیسری آیة ۔ خداوند عالم نے فرعون کی بات جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی اس طرح نقل کی ہے :۔ ولبثت فینا من عمرك سنین و فعلت فعلتك التی فعلت وانت من الکافرین یعنی اے موسیٰؑ تم اپنی عمر سے برسوں میرے ہاں رہے اور تم نے وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی اور تم کافروں سے ہو (پارہ ۱۹ ع ۶) اس کی تفسیر میں علامہ بیضاوی نے لکھا ہے فانه علیه السلام کان یعالجهم بالتقیه یعنی فرعون نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم کافروں سے ہو تو اس وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ ان فرعونیوں کے ساتھ تقیہ کی زندگی بسر کرتے تھے (تفسیر بیضاوی جلد ۲ ص ۱۰۴) اور علامہ چلپی نے تفسیر بیضاوی کے حاشیہ پر لکھا ہے ولم یذکر المصنف احتمال لافتراء علیه لبعده فان فرعون لو کان عالما بان موسیٰ علیه السلام یتدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸)

هو استثناء عن کفر بلسانه ووافق المشرکین بلفظه مکرها لما ناله من ضرب واذی وقلبه ما یقول وهو مطمئن بالایمان بالله ورسوله یعنی اس آیت کے حکم سے وہ لوگ الگ کردیئے گئے ہیں جو مجبور ہو کر کہ اگر نہ کہیں گے تو مارے جائیں گے یا ان کو اذیت پہنچائی جائیگی صرف زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دیں اور مشرکین کی موافقت صرف اس بات سے کردیں مگر ان کا دل اس بات کو قبول نہ کرے بلکہ اس میں پورا پورا ایمان بھرا ہو۔ وبهذا اتفق العلماء علی ان المکره علی الکفر یجوز له ان یوالی ابقاء لمهجته یعنی جس شخص پر کفر کے لیے زبردستی اور جبر کیا جائے اس کو جائز ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کافروں کے موافق باتیں کہہ دے (تفسیر ابن کثیر مطبوعہ مصر جلد ۵ ص ۳۸۱) علامہ فخر الدین رازی نے بھی ان باتوں کو تفصیل سے لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۲۴) اور جناب مولوی نواب صدیق حسن خان صاحب بھوپالی نے لکھا ہے اجمع المفسرون واهل العلم علی ان من اکره علی الکفر حتی خشی علی نفسه القتل انه لا اثم علیه ان کفر وقلبه مطمئن بالایمان ولا تبین منه زوجته ولا یحکم علیه بحکم الکفر یعنی مفسرین اور علماء اعلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص کفر کی بات کہنے پر مجبور کردیا جائے یہاں تک کہ اسے اپنے قتل ہوجانے کا خوف ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے وہ کفر کی بات کہہ دے درحالیکہ اس کے دل میں ایمان بھرپور ہو۔ پھر نہ وہ کافر ہوگا۔ اس کی زوجہ اس سے علیحدہ کی جائے گی۔ نہ اس پر کسی بات میں کفر کا حکم کیا جائے گا۔ انها عامة فی من اکره من غیر فرق من القول والفعل والمعنی الامن کفر باکراه والحال ان قلبه مطمئن بالایمان لم تتغیر عقیدته یعنی یہ آیت عام ہے اس شخص کے بارے میں جو مجبور کردیا جائے اور کسی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ وہ زبان سے بولنے پر مجبور کیا جائے یا کوئی کام کرنے پر ہر حالت میں وہ معذور ہے اور معنی یہ ہے کہ جو شخص کفر کا کلمہ بولنے پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو کہ اس کے عقیدے میں کوئی فرق نہ آئے۔ (تفسیر فتح البیان جلد ۵ ص ۲۷۹)

يغير دينهم سبحنه بل قتله انتهى يعنی مصنف (علامہ بیضاوی) نے یہ احتمال نہیں پیدا کیا کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو جو کافروں سے کہا یہ اس نے حضرت پر افتراء کیا تھا اسلئے کہ ایسا احتمال بعید ہے کیونکہ اگر حضرت موسیٰؑ واقعاً کافروں کی زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ ان سے الگ ہوتے تو فرعون کو فوراً خبر ہو جاتی کہ یہ ہمارے مذہب پر نہیں ہیں اور جب اس کو اس کی اطلاع ہو جاتی کہ موسیٰؑ اس کے مذہب پر نہیں ہیں تو وہ انہیں فوراً قید بلکہ قتل کر دیتا۔ انتہیٰ۔ اس بیان سے واضح ہو گیا کہ حضرت موسیٰ نے علامہ بیضاوی کی تحقیق کے مطابق تیس سال تک تقیہ میں بسر کیے کہ فرعون والوں میں رہتے مگر اپنا ایمان کو چھپائے ہوئے تھے اور کافروں کے ڈر سے اپنا واقعی مذہب ظاہر نہیں کرتے تھے۔ [۱]

چوتھی آیۃ۔ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ وقال رجل مومن من آل فرعون يكتم ايمانه اتقتلون رجلاً ان يقول ربی الله یعنی کے لوگوں میں سے ایک شخص جو ایماندار تھا اور اپنے ایمان کو چھپاتا تھا بولا کیا تم صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اس کو قتل کرنا چاہتے ہو (پارہ ۲۴ ع ۹) اور ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے ایمان کو اسی وجہ سے چھپاتا تھا کہ فرعون کو

۱۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ نسفی نے بھی لکھا ہے هذا افتراء منه عليه لانه معصوم من الكفر وكان يعايشهم بالتقية یعنی فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر یہ افتراء کیا جو کہا کہ تم کافروں سے ہو کیونکہ حضرت موسیٰؑ کافر نہیں تھے بلکہ وہ حضرت تو کفر سے معصوم تھے۔ ہاں وہ ان لوگوں کے ساتھ تقیہ کی زندگی بسر کرتے تھے (تفسیر مدارک التنزیل جلد ۳ ص ۳۵۹) اور علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے قد افترى على موسى، او جهل امره لانه كان يعايشهم بالتقية وانما قلنا انه افتراء او جهل لان الكفر غير جائز على الانبياء ولو قبل النبوة یعنی فرعون نے جو حضرت موسیٰؑ کو کہا کہ تم کافروں سے ہو تو یہ اس نے حضرت پر افتراء کیا یا جہالت سے آپ کو کفر کی نسبت دی تو اس وجہ سے کہ انبیاء پر کفر جائز نہیں ہے وہ نبوت کے پہلے بھی کافر نہیں ہو سکتے (تفسیر غرائب القرآن جلد ۱۹ ص ۵۲۰) علامہ زمخشری نے بھی یہی عبارت لکھی اور حضرت موسیٰؑ کا تقیہ ثابت کیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر کشاف جلد ۲ ص ۳۳۸ مطبوعہ مصر) علامہ فخر الدین رازی نے بھی لکھا ہے وقد افترى عليه او جهل امره لانه كان يعايشهم بالتقية فان الكفر غير جائز على الانبياء قبل النبوة یعنی فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر افتراء کیا یا جہالت سے ان کو کافر کہا کیونکہ حضرت موسیٰؑ ان سبھی میں تقیہ کی زندگی بسر کرتے تھے (تفسیر کبیر جلد ۶ ص ۵۱۰)

معلوم ہو جائے گا تو اس کو قتل کر دیگا۔ غرض اپنی جان کی حفاظت ہی کے لیے اور فرعون کے قتل کے ڈر ہی سے وہ شخص اپنا ایمان پوشیدہ رکھتا تھا اور یہی تقیہ ہے۔ علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے الصدیقون ثلاثۃ حبیب البخار و مومن آل فرعون حیث قال اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ ۔ والثالث علی ابن ابی طالب وھو افضلھم یعنی صدیق تو بس تین ہی شخص ہیں ۔ ایک حبیب بخار۔ دوسرے آل فرعون کا مومن جس نے فرعون سے کہا تھا کہ کیا تم لوگ ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔ تیسرے علیؑ ابن ابی طالبؑ۔ اور یہ تینوں میں افضل ہیں (تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۳۱۷)

پانچویں آیۃ ۔خدا نے فرمایا: لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ یعنی اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو (پارہ ۲ رکوع ۸) اور معلوم ہے کہ تقیہ نہ کرنے سے بعض اوقات انسان ہلاکت میں پڑتا ہے اور قتل کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہلاکت کے موقع پر تقیہ کرنا واجب ہوا۔

احادیث سے تقیہ کی دلیلیں

پہلی دلیل۔ امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں قصہ صلح حدیبیہ کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے جسکی پوری عبارت یہ ہے:

قال الزهری فی حدیثه فجاء سهیل ابن عمرو۔ فقال هات اکتب بیننا و بینکم کتابا۔ و دعا النبی صلی الله علیه وسلم الکاتب فقال النبیؐ اکتب بسم الله الرحمن الرحیم ۔ قال سهیل اما الرحمن فو الله ما ادری ما هو ولکن اکتب باسمك اللهم۔ کما کنت تکتب ۔ فقال المسلمون والله لا نکتبها الا بسم الله الرحمن الرحیم ۔ فقال النبی صلی الله علیه وسلم اکتب باسمك اللهم ۔ ثم قال هذا ما قاضی علیه محمد رسول الله ۔ فقال سهیل والله لو کنا نعلم انك رسول الله ما صددناك عن البیت ولا قاتلناك۔ ولکن اکتب محمد بن عبدالله۔ فقال النبی والله انی رسول الله وان کذبتمونی اکتب محمد بن عبدالله۔ قال الزهری و ذلك لقوله یسالونی خطة یعظمون فیها حرمات الله الا اعطیتهم ایاها ۔ فقال له النبی صلی الله علیه وسلم علی ان تخلو بیننا و بین البیت فنطوف به۔ فقال سهیل والله لا تحدث العرب انا اخذنا ضغطة ولکن ذاك من العام المقبل فکتب۔ فقال سهیل و علی انه لا یاتیك منا رجل وان کان علی دینك الا رددته الینا۔ قال المسلمون سبحان الله کیف یرد الی المشرکین وقد جاء مسلما۔ فبیناهم کذلك

اذ دخل ابو جندل بن سهيل بن عمرو يرسف فی قيوده۔ وقد
خرج من اسفل مكة حتی رمی بنفسه بين اظهر المسلمين ۔
فقال سهيل هذا يا محمد اول ما اقاضيك عليه ان ترده الی۔
فقال النبی صلی الله عليه وسلم انا لم نقض الكتاب بعد۔
قال فوالله اذا لا اصالحك علے شئ ابدا ۔ قال النبی صلی الله
عليه وسلم فاجزه لی۔ قال ما انا بمجيزه لك۔ قال بلی فافعل۔
قال ما انا بفاعل ۔ قال مكرز بلی قد اجزناه لك۔ قال ابو جندل
اے معشر المسلمين ارد الی المشركين؟۔ وقد جئت مسلماً ۔
الا ترون ما قد لقيت وكان قد عذب عذاباً شديدا فی الله۔ قال
فقال عمر ابن خطاب فاتيت نبی الله صلی الله عليه وسلم
فقلت الست نبی الله حقا؟ قال بلی قلت السنا علی الحق وعدونا
علی الباطل؟ قال بلی ۔ قلت فلم نعطی الدنية فی ديننا اذاً۔
قال انی رسول الله و لست اعصيه و هو ناصری۔ قلت اوليس
كنت تحدثنا انا سناتی البيت فنطوف به۔ قال بلی افا خبرتك
انا ناتيه العام۔ قال قلت لا ۔ قال فانك آتية ويطوف به۔ قال
فاتيت ابابكر فقلت اليس هذا نبی الله حقا؟ قال بلی قلت
السنا علے الحق وعدونا علے الباطل؟ قال بلی۔ قلت فلم انعطی
الدنية فی ديننا اذا؟ قال ايها الرجل انه لرسول الله صلی الله
عليه وسلم و ليس يعصی ربه وهو ناصره۔ فاستمسك بغرزه
فوالله انه علے الحق۔ قلت اليس كان يحدثنا انا سناتی البيت
ونطوف به قال بلی فاخبرك انك تاتيه العام ؟ قلت لا ۔ قال

فانك آية و يطوف به۔ قال الزهری قال عمر فعملت لذلك اعمالا۔

یعنی حضرت زہری نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے کہ اس کے بعد سہیل بن عمرو آیا اور کہا آؤ میرے اور اپنے درمیان ایک معاہدہ صلح نامہ لکھ دو تب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاتب کو بلایا اور اس سے فرمایا کہ لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ اس پر سہیل (کافر) بولا یہ رحمن کون ہے؟ خدا کی قسم مجھے تو اس کا کوئی حال نہیں معلوم ہے۔ اسکے عوض یہ لکھو باسمك اللهم جیسا تم لوگ پہلے لکھا کرتے تھے۔ا؎ اس پر مسلمانوں نے کہا خدا کی قسم ہم اس طرح تو نہیں لکھیں گے بلکہ بسم الله الرحمن الرحيم ہی لکھا جائے گا مگر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ (نہیں بلکہ جس طرح یہ لوگ کہتے ہیں) اسی طرح لکھو باسمك اللهم ۔ اس کے بعد حضرتؑ نے کاتب سے فرمایا کہ لکھو یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہؐ نے معاہدہ کیا ہے۔ ابھی حضرتؑ یہ جملہ پورا نہیں کر پائے تھے کہ سہیل بول پڑا خدا کی قسم اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ تم اللہ کے رسول ہو تو نہ ہم تم کو خانہ کعبہ کی طرف جانے سے روکتے اور نہ تم سے لڑائی کرتے۔ البتہ اس طرح لکھواؤ یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے معاہدہ کیا ہے۔ اس کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیا کہ خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ضرور ہوں۔ لیکن اگر تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہو تو خیر محمد بن عبداللہ ہی لکھ لو۔ زہری بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کی بات اس وجہ سے مانتے جاتے تھے کہ حضرتؑ نے فرمادیا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے جس جس بات کی فرمائش کریں گے جسمیں حرمات خدا کی تعظیم کریں گے میں ان سب کو قبول کرتا جاؤں گا۔ اس کے بعد حضرتؑ نے صلح نامہ کی عبارت

ا؎ ۔ زمانہ جاہلیت میں خدا کا نام اسی طرح لکھتے تھے باسمك اللهم یعنی اے اللہ میں تیرے نام سے اس کام کو شروع کرتا ہوں۔ ۱۲ مترجم

لکھوائی کہ ہم لوگوں میں یہ طے پایا ہے کہ یہ مکہ والے ہم لوگوں کو چھوڑ دیں کہ ہم جا کر خانہ کعبہ کی زیارت اور اس کا طواف کریں۔ اس پر بھی سہیل بولا نہیں خدا کی قسم یہ نہیں ہوگا۔ اس سے تو تمام عرب میں ہم لوگوں کی ذلت ہوجائے گی۔ سب کہیں گے کہ ہم لوگ دب گئے اور مجبور ہوکر طواف کرنے کی اجازت دے دی۔ اس سال تم لوگ واپس جاؤ۔ البتہ سال آئندہ تم لوگوں کو زیارت کرنے کا موقع دے دیں گے۔ چنانچہ صلح نامہ میں یہ عبارت لکھ دی گئی۔ اس کے بعد سہیل نے کہا یہ بھی لکھوا دو کہ ہم (مکہ والوں) سے جو شخص (مسلمان ہوکر) تمہارے پاس جائے گا اس کو تم ہم لوگوں کے پاس ضرور واپس کردو گے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ جو شخص مسلمان ہوکر ہم لوگوں کے پاس آئے گا وہ مشرکین کی طرف کس طرح پلٹایا جائے گا؟ ابھی ہم لوگ یہی گفتگو کررہے تھے کہ دفعتہ ابو جندل بن سہیل بن عمرو وہاں پہنچا جو اپنے پاؤں کی بیڑیاں اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ مکہ کے نشیبی حصہ سے نکل کر چل پڑا تھا۔ یہاں تک کہ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان ڈال دیا۔ اس کے دیکھتے ہی سہیل بولا اے محمدؐ یہ پہلا شخص ہے جس کے بارے میں میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہورہا ہے اس کو مجھے واپس دیدو۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا واہ ابھی تو معاہدہ پورا لکھا بھی نہیں گیا ہے۔ بلکہ تکمیل معاہدہ کے قبل یہ ہم لوگوں کے پاس پہنچ گیا ہے یہ کیونکر اس شرط میں داخل ہوسکتا ہے؟ سہیل بولا خدا کی قسم تب میں تم سے کسی بات پر بھی صلح نہیں کرسکتا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بس اس (ابو جندل) کو میرے لیے چھوڑ دو۔ سہیل نے جواب دیا جی نہیں میں اس کو تو نہیں چھوڑ سکتا۔ حضرتؐ نے فرمایا دیکھو میری بات مان لو اس کو چھوڑ دو۔ وہ اب بھی بولا کہ یہ نہیں ہوسکتا مگر اس کے ساتھی مکرز نے کہا اچھا میں اس کو آپ کے

لیے چھوڑ دیتا ہوں (لیکن سہیل کسی طرح راضی نہیں ہوا) تب ابو جندل بولا کہ اے مسلمانو میں تمہارے پاس مسلمان ہو کر آیا ہوں کیا تم لوگ مجھے پھر مشرکوں کے پاس لوٹا دیتے ہو؟ تم میری حالت نہیں دیکھتے کہ ان سبھی نے صرف اس وجہ سے کہ میں نے خدا کا سچا دین قبول کرلیا مجھے کس قدر ستایا اور مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے۔ زہری بیان کرتے تھے کہ اتنی گفتگو کے بعد حضرت عمر ابن الخطاب کی یہ حالت ہوئی کہ وہ خود فرماتے تھے میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کیا آپ خدا کے سچے رسولؐ نہیں ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ضرور ہوں۔ میں (حضرت عمر) نے کہا اور کیا ہم لوگ بھی حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ حضرت نے فرمایا بے شک ہم لوگ حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر ہیں۔ میں نے کہا پھر ہم لوگ اپنے مذہب میں دباؤ اور ذلت کیوں سہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا میں تو خدا کا رسولؐ ہوں۔ وہ (خدا) مجھے جو حکم دیتا ہے اس کی مخالفت نہیں کرسکتا اور وہی میرا مددگار بھی ہے۔ تب میں (حضرت عمر) نے کہا کیا آپ ہم لوگوں سے یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم جلد خانہ کعبہ کی زیارت کو پہنچیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں ضرور میں کہتا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال وہاں پہنچیں گے اور اسی سال اس کا طواف کریں گے؟ میں (حضرت عمر) نے کہا نہیں یہ تو آپ نے نہیں کہا تھا۔ حضرتؐ نے فرمایا پھر میں نے غلط کیا کہا۔ تم لوگ (آئندہ) ضرور خانہ کعبہ پہنچو گے اور اس کا طواف کرو گے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ (حضرت کی اس بات سے میری تشفی نہیں ہوئی تو) میں ابوبکر کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کیوں بھائی۔ یہ شخص (حضرت رسول خداؐ) کیا خدا کے سچے نبی نہیں ہیں؟ ابوبکر نے کہا ہاں ضرور ہیں۔ میں نے کہا۔ اور کیا ہم لوگ حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں

ہیں؟ ابوبکر نے کہا بیشک ہم لوگ حق پر اور یہ لوگ باطل پر ہیں۔ تب میں نے کہا پھر ہم لوگ اپنے مذہب میں دبیں کیوں؟ حضرت ابوبکر نے کہا اے بھائی وہ خدا کے رسولؐ ہیں اور اپنے پروردگار کی مخالفت نہیں کریں گے اور وہی خدا ان کا حامی و مددگار ہے۔ تم ان ہی کی رکاب تھامے رہو (یعنی تابعداری اور پیروی کرو) کیونکہ خدا کی قسم یہ حق پر ہیں۔ میں (حضرت عمر) نے کہا کیا یہ (رسولؐ) ہم لوگوں سے یہ بیان نہیں کیا کرتے تھے کہ ہم لوگ جلد خانہ کعبہ کی زیارت کو پہنچیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ ابوبکر نے کہا ہاں کہتے تو تھے مگر کیا یہ بھی کہتے تھے کہ اسی سال تم وہاں پہنچو گے اور طواف کرو گے؟ میں (حضرت عمر) نے کہا نہیں یہ تو نہیں کہتے تھے۔ ابوبکر نے کہا پھر غلط کیا ہوا؟ آئندہ وہاں جاؤ گے اور طواف کرلو گے۔ جناب زہری بیان کرتے تھے کہ حضرت عمر کہتے تھے کہ میں نے اس بے ادبی کی وجہ سے بہت سے اعمال کیے (صحیح بخاری پارہ ۱۱ ص ۸ مطبوعہ دہلی) [۱] اور اسی صحیح بخاری کی کتاب المغازی غزوہ حدیبیہ کے ذکر میں لکھا ہے فرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابا جندل بن سہیل یومئذ الی ابیہ سہیل بن عمرو ولم یات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد من الرجال

---

[۱] بہت سی کتابوں میں ہے کہ حضرت عمر کو اس روز جناب رسالت مآب صلعم کی نبوت میں بڑا شک ہوگیا۔ محدث دہلوی نے لکھا ہے از عمر بن الخطاب کہ گفت درآمد درآں روز در دل من امر عظیم یعنی حضرت عمر کہتے تھے کہ اس روز میرے دل میں خطرہ عظیم گذرا (مدارج النبوۃ ص ۲۶۴) اور علامہ دیار بکری اور علامہ سیوطی نے لکھا ہے روی عن عمر انہ قال واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ یعنی حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ جب سے میں مسلمان ہوا آج کے سوا مجھے کبھی شک نہیں ہوا (تفسیر در منثور جلد ۹ ص ۷۷ و تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۴) حضرت عمر خود بھی اپنے اس شک کو عظیم سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے جعلت کثیرا من الاعمال الصالحۃ من الصوم والصلوۃ والصدقۃ کفارۃ لتلک الجرأۃ التی صدرت منی یومئذ۔ یعنی صلح حدیبیہ کے روز جو جرأت مجھ سے سرزد ہوئی اس کے کفارہ میں اکثر اعمال صالحہ مثل روزہ نماز و صدقے کے میں کرتا رہا (تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۵ و سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶۸ وغیرہ) صحابہ کو اس صلح پر اس قدر رنج اور غصہ ہوا کہ آنحضرتؐ ان لوگوں سے بار بار فرماتے رہے کہ یہیں سے قربانی کرکے اور بال منڈوا کر واپس چلو لیکن باوجود اس تاکید کے کسی نے بھی اس کی تعمیل نہیں کی (تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۵ و تاریخ طبری و تاریخ کامل وغیرہ)

الارذئی تلك المدة وان كان مسلما انتها۔ یعنی حضرت رسولؐ خدا نے ابو جندل بن سہیل کو اس کے باپ سہیل بن کے عمر کے حوالہ کر دیا اور اس مدت میں حضرت رسول خدا صلعم کی یہ پابندی رہی کہ آپؐ کے پاس مکہ والوں سے جو شخص بھی آتا تھا اگرچہ وہ مسلمان ہوتا تھا حضرتؐ اس کو کفار کے پاس واپس کر دیتے تھے (صحیح بخاری پارہ ۱۶ ص ۸۹) ان عبارتوں سے مثل آفتاب روشن ہوگیا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو جندل کو جو مسلمان ہو کر حضرتؐ کی پناہ میں آیا تھا ان شریر کافروں کے پاس جو یقیناً اس کو سخت عذابوں میں مبتلا کئے ہوئے تھے اور آنحضرتؐ کے پاس سے واپس لے جانے کے بعد بھی اس پر سخت سے سخت ظلم کرنے والے تھے اور ابو جندل کی طرح دوسرے لوگوں کو بھی جو مکہ سے مسلمان ہو کر آنحضرت کی خدمت میں امن و پناہ حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے ان کافروں کی طرف واپس کر دینا بطور تقیہ ہی تو تھا کیونکہ حضرتؐ کو یقیناً معلوم تھا کہ ان نومسلموں کو کفار کے پاس واپس کرنے سے یہ سب پھر مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے۔ باوجود اس کے حضرتؐ ان لوگوں کو ان دشمنوں کے پاس لوٹا دیتے تھے۔ حالانکہ آنحضرتؐ کے ساتھ جو مسلمان تھے وہ اس پر رضی بھی نہیں تھے کہ ان نومسلموں کو کافروں کے پاس واپس کیا جائے۔ یہاں تک کہ خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم صاحب نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم لوگ اپنے مذہب میں اس ذلت اور خواری کو کیوں گوارہ کریں اور اس کی وجہ سے ان کو حضرت رسول خدا صلعم کی نبوت اور حقیقت ہی میں شک ہوگیا۔ اس مقام پر علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: قال الخطابی تاول العلماء ماوقع فی قصة ابی جندل علی وجهین احدهما ان الله قد اباح التقية للمسلم اذا خاف

الهلاك ورخص له ان يتكلم بالكفر مع اضمار الايمان وان لم يمكنه التورية فلم يكن رده اليهم اسلاما لابي جندل الى الهلاك مع وجود السبيل الى الخلاص من الموت بالتقية والوجه الثانی انما رده الی ابیه والغالب ان اباه لا یبلغ به الی الهلاك وان عذبه و سجنه فله مندوحة بالتقية ایضا۔

یعنی خطابی نے لکھا ہے کہ ابو جندل کے بارے میں آنحضرتؐ نے جو عمل کیا کہ اس کو کافروں میں واپس کر دیا۔ علماء نے اس کی تاویلیں دو طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا نے ہر مسلمان کے لیے تقیہ جائز کیا ہے اور اس کو اجازت دی ہے کہ اگر توریہ کرنا ممکن نہ ہو تو جب اس کو ہلاک ہونے کا ڈر ہو تو صرف دل میں ایمان کا عقیدہ رکھ کر زبان سے کفر کی باتیں کہہ دے۔ پس جب ابو جندل کو تقیہ کر کے اپنی جان بچا لینے کی صورت موجود تھی تو حضرتؐ نے جو اس کو کفار کے حوالہ کر دیا اس سے حضرت اعتراض سے بچ گئے کیونکہ تقیہ کی صورت میں ابو جندل کے ہلاک ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ دوسری تاویل اس طرح کی ہے کہ حضرت نے ابو جندل کو اس کے باپ ہی کے پاس تو واپس کیا اور گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو خواہ تکلیف پہنچائے یا قید کرے مگر اس کو ہلاک نہیں ہونے دے گا تو اس صورت میں تقیہ سے بھی وسعت تھی۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۱) اور علامہ احمد قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اور ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ میں بھی خطابی کی اس عبارت کو نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو مواہب لدنیہ جلد ا ص ۱۲۸ و مرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۴ ص ۲۹۸ مطبوعہ مصرؔ جلد ۸ ص ۸۳ طبع ملتان)

تقیہ کی دوسری دلیل۔ تقیہ کی دوسری دلیل حدیث اور تاریخی واقعہ سے یہ ہے کہ حضرت رسول خدا صلعم نے کافروں کے کہنے سے اپنے نام کا

ضروری لفظ رسول اللہ مٹا دیا۔ چنانچہ امام بخاری نے لکھا ہے : فلما کتبوا الکتاب کتبوا ھذا ما قاضی علیه محمد رسول الله قالوا لانقر بھذا۔ لو نعلم انك لرسول الله ما منعناك شئیا فقال انا رسول الله وانا محمد بن عبدالله ۔ ثم قال لعلی امح رسول الله قال علی لا والله لا امحوك ابدا۔ فاخذ رسول الله الکتاب ولیس یحسن ان یکتب فکتب ھذا ما قاضی علیه محمد بن عبدالله۔ یعنی جب لوگوں نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھنا شروع کیا تو لکھا کہ وہ یہ صلح نامہ ہے جس کا معاہدہ محمد رسول اللہ نے کیا ہے اس پر کفار مکہ بولے ہم تو اس کو نہیں مانتے ہیں۔ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں تو آپ کو کس چیز سے روکتے ہی نہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا میں خدا کا رسول بھی ہوں اور عبداللہ کا فرزند بھی ہوں۔ پھر (حضرت علیؑ سے) فرمایا اے علیؑ میرے نام سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دو۔ حضرت علیؑ نے عرض کی یا رسول اللہ خدا کی قسم اس نے مجھے اس کی طاقت ہی نہیں دی ہے کہ اس لفظ کو مٹا دوں نہ قیامت تک یہ بات مجھ سے ہو سکتی ہے۔ اس پر حضرتؐ نے وہ صلحنامہ حضرت علیؑ کے ہاتھ سے لے لیا اور اگرچہ آپ لکھ نہیں سکتے تھے مگر یہ لکھدیا کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے معاہدہ کیا ہے (صحیح بخاری پارہ ۱۷ ص ۷۷) اور محدث دہلوی شیخ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے پس آں حضرت علی را طلبید و فرمود بنویس بسم الله الرحمن الرحیم. سہیل گفت ما رحمان را می شناسم دور روایتے گفت اما الرحمن الرحیم ۔پس نمی شناسیم ما آں را بنویس باسمك اللھم چنانکه پیشتر می نوشتی الرحمن الرحیم پس مسلمانان گفتند والله ما نمی نویسیم مگر بسم الله الرحمن الرحیم را پس فرمود آنحضرت ۔یا علی بنویس باسمك اللھم علی فرمود آنحضرت ہم چنیں نوشت باسمك اللھم.

بعد ازاں فرمود هذا ما قاضی به محمد رسول الله و علی این را نوشت، سهیل گفت ما اقرار رسالت تو نداریم. والله اگر می دانستیم که رسول خدائی ترا از زیارت خانه او منع نمیکردیم. بنویس محمد بن عبدالله. سید کائنات علیه افضل الصلوة گفت من محمد رسول الله ام وهم محمد بن عبدالله بنویس محمد بن عبدالله و محو کن لفظ رسول الله را. بنویس محمد ابن عبدالله علی مرتضی گفت من هرگز وصف رسالت را محو نسازم. و آمده است که علی صحیفه را از دست بینداخت و دست بشمشیر بزد و این امتناع علی از محو لفظ رسول الله نه از باب ترک امتثال است که مستلزم ترک ادب است بلکه عین امتثال ادب و ناشی از غایت عشق و محبت است، پس بستد نامه را و محو کرد لفظ رسول الله را و نوشت بجائے آں محمد بن عبدالله۔

یعنی جب صلحنامہ لکھنے کی تجویز ہوئی تو حضرت رسول خدا ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔اس پر (کافروں کے وکیل) سہیل نے کہا ہم لوگ رحمن کو تو پہچانتے نہیں ہیں۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا کہ یہ رحمن رحیم کون ہے۔ اس کو تو ہم لوگ پہچانتے بھی نہیں۔ اس کے عوض اس طرح لکھو باسمك اللهم جس طرح تم لوگ پہلے بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم لوگ تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی لکھیں گے مگر آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ اچھا اسی طرح لکھ دو۔ باسمك اللهم ۔حضرت علیؑ نے جناب رسالت مآب ﷺ کا ارشاد اسی طرح لکھ دیا باسمك اللهم ۔اسکے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا کہ لکھو یہ وہ صلحنامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ نے معاہدہ کیا ہے اور حضرت علیؑ نے اس جملہ کو لکھ دیا۔ تب سہیل بولا ہم لوگوں کو تو آپ کے رسول خدا ہونے کا اعتقاد نہیں ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم لوگ

جانتے کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت سے ہرگز نہ روکتے۔ اس کے عوض یہ لکھوایئے کہ یہ وہ صلحنامہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے معاہدہ کیا ہے۔ حضرت سید کائنات علیہ افضل الصلوۃ نے فرمایا کہ میں محمد رسول اللہ بھی ہوں اور محمد بن عبداللہ بھی ہوں۔ اچھا علی تم محمد بن عبداللہ ہی لکھو۔ میرے نام سے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھدو۔ حضرت علیؑ نے عرض کی یا حضرتؐ مجھ سے تو کسی طرح آپ کا وصف رسالت مٹایا ہی نہیں جائے گا۔ روایت میں وارد ہوا ہے کہ اس کے بعد حضرت علیؑ نے صلحنامہ کا وہ کاغذ اپنے ہاتھ سے گرا دیا اور تلوار کھینچ کر (کفار کی طرف بڑھنا) چاہا یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت علیؑ نے جو آنحضرتؐ کے نام سے لفظ رسول اللہ مٹانے سے اپنی مجبوری اور عاجزی ظاہر کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرتؑ نے معاذاللہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی پابندی نہیں کی جس سے یہ شبہ ہو کہ حضرتؑ نے آنحضرتؐ کا ادب ترک کیا بلکہ یہ تو عین ادب اور کمال تعظیم تھا جو انتہا درجہ کے عشق و محبت رسالت کو ظاہر کرتا ہے (کیونکہ حضرت علیؑ کے دل و دماغ میں آنحضرتؐ کی رسالت و نبوت کا ایسا گہرا یقین تھا کہ حضرت کا ہاتھ ہی اس بے ادبی کی طرف نہ بڑھ سکا کہ آپ اس لفظ رسول اللہ کو آنحضرتؐ کے نام سے مٹا سکیں)۔ اس پر آنحضرتؐ نے وہ صلحنامہ خود لے لیا اور اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر اس جگہ محمد بن عبداللہ لکھدیا ۱؎ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۲۶۳)

۱؎ مدارج النبوۃ کے اسی صفحہ میں اس کے بعد ہی یہ عبارت بھی ہے آنحضرت فرمود کہ اے علی ترا ہم در وقتے این چنین معاملہ پیش خواهد آمد و می گویند کہ چون در قضیہ صفین بر صلح قرار یافت در صلح نامہ نوشتند کہ این کتابت مصالحہ امیرالمومنین علی است با معاویہ ابن ابی سفیان معاویہ گفت کہ لفظ امیرالمومنین محو سازند و بنویسند علی ابن ابی طالب اگر من او را امیرالمومنین دانم با او مقاتلہ نکنم و مطاوعۃ و متابعۃ او نمایم. پس علی گفت صدق رسول اللہ هم چنان کہ معویہ می گوید بنویسند یعنی اس کے بعد آنحضرت صلعم نے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳ پر)

تیسری دلیل۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے: عن عائشه ان رجلا استاذن علی النبی صلی الله علیه وسلم فقال ائذنوا له فبئس اخوالعشیرة فلما جلس تطلق النبی صلی الله علیه وسلم فی وجهه وانبسط الیه۔ فلما انطلق الرجل قال عائشة یارسول الله قلت له کذا و کذا ثم تطلقت فی وجهه وانبسطت الیه۔ فقال رسول الله متی عاهدتی فحاشا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳)

حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علیؑ ایک وقت میں تم کو بھی ایسا ہی معاملہ پیش آنے والا ہے۔ چنانچہ بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ صفین میں طے ہوا کہ حضرت علیؑ و معاویہ کے درمیان صلح ہو جائے تو صلحنامہ میں یہ عبارت لکھی جانے لگی کہ یہ صلحنامہ ہے درمیان امیر المومنین علی اور معاویہ بن ابوسفیان کے۔ اس پر معویہ بولا کہ حضرت علیؑ کے نام سے لفظ امیر المومنین کو نکال دو اور علی ابن ابی طالب لکھو۔ اگر میں ان کو امیر المومنین جانتا تو ان سے لڑائی ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی اطاعت اور فرمان برداری کرتا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا حضرت رسول خدا صلعم نے کس قدر صحیح فرمایا تھا۔ بالکل وہی ہوا۔ بہتر ہے جس طرح معویہ کہتا ہے اسی طرح لکھ دو۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۲۴۳) یہ واقعہ اور بھی معتبر کتب تاریخ و سیرت اہلسنت میں موجود ہے۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر جزری نے لکھا ہے۔ فکتب موضع رسول الله محمد بن عبدالله و قال العلی لتعلمن بمثلها یعنی آنحضرت صلعم نے صلحنامہ میں رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ کر ارشاد فرمایا کہ اے علیؑ ایک وقت تم کو بھی ایسا ہی معاملہ پیش آئیگا (تاریخ کامل جلد ۲ ص ۷۷) اور علامہ دیار بکری نے لکھا ہے فقال یا علی سیکون لك مثل هذه الواقعة وهذا الکلام کان اشارة الی انه لما وقعت المصالحه بین علی و معویه بعد حرب صفین و کتب الکاتب فی کتاب الصلح هذا ما صالح امیر المومنین علی۔ قال معویه لا تکتب امیر المومنین لو کنت اعلم انه امیر المومنین ماقاتلته ولکن اکتب علی ابن ابیطالب فلما سمع ذلك علی تذکر قول النبی صلی الله علیه وسلم له یوم الحدیبیه فقال صدق رسول الله صلی الله علیه وسلم اکتب علی ابن ابی طالب (تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۳) اس کا مطلب بھی وہی ہے جو مدارج النبوۃ کی عبارت کا اوپر لکھا گیا۔ اور روضۃ الاحباب میں ہے کہ حضرت روئے مبارك را بسوئے علی ابن ابی طالب آورد و گفت یا علی ترا مثل این واقعه بحسب ضرورت روے خواهد نمود (روضۃ الاحباب جلد ۱ ص ۳۵۶) اور مدارج النبوۃ میں ہے کہ آنحضرت فرمود که اے علی ترا هم دریں وقتے ایں چنین معامله پیش خواهد آمد (جلد ۲ ص ۱۹۵) اور روضته الصفاء میں ہے که چوں از تحریر عهد نامه فراغت دست داده حضرت رسول روئے مبارك بعلی آورد و فرمود یاعلی ترا هم بضرورت مثل ایں روے خواهد نمود (جلد ص)

ان سب عبارتوں کا مطلب بھی وہی ہے جو مدارج النبوۃ کی عبارت کا پہلے بیان کیا گیا اور خصائص نسائی میں ہے قال صلعم لعلی امالك مثلها ستاتیها وامضانت یعنی حضرت رسول خداؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ عنقریب تم کو بھی مجبوراً ایسی صورت پیش آئیگی۔

ان شر الناس عند الله منزلة یوم القیامة من ترکه الناس اتقاء شرہ
وفی روایة اتقاء فحشه

یعنی حضرت عائشہ بیان کرتی تھیں کہ ایک شخص نے حضرت رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ آنے دو اس لئے کہ یہ اپنی قوم کا بُرا آدمی ہے (اگر اجازت نہیں دوں گا تو خوف ہے کہ میری برائی بیان کرتا پھرے) غرض جب وہ حاضر ہوا تو حضرت نے اس کی خاطر مدارۃ کرنے اور اس کی ملاقتہ سے خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا تو میں (عائشہ) نے عرض کی کہ اے رسول خدا ﷺ پہلے تو آپ نے اس شخص کے بارے میں فلاں فلاں (بُری) باتیں کہی تھیں مگر جب وہ آپ کے پاس پہنچ گیا تو آپ نے اس سے خوشی ظاہر کی اور اس سے عزت و خصوصیت کا برتاؤ کیا۔ حضرت نے جواب دیا کہ عائشہ تم نے مجھے کب بدزبان بدگو اور فحش بکنے والا پایا؟ یہ یقینی بات ہے کہ قیامت کے روز خدا کے ہاں سب سے برا شخص وہ ہوگا جس سے لوگ اس کی برائی کے خوف سے الگ رہا کریں۔ یہ حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بھی ہے۔ مشکوۃ کتاب الادب باب حفظ اللسان والغیبۃ جلد ۶ ص ۹۹) اور جناب ملا علی قاری صاحب نے لکھا حضرت کے اس قول ''اے عائشہ تم نے مجھے کب بدزبان پایا'' کی شرح میں لکھا ہے هذا انکار علی قولها انك خالفت بين الغيب والحضور فلم لم تذمه في الحضور كما ذممته في الغيبه یعنی حضرت عائشہ کے سوال کا مطلب درحقیقت حضرت رسول خدا ﷺ پر اعتراض کرنا تھا کہ جب وہ شخص باہر تھا تو آپ نے اس کی برائی بیان کی اور جب وہ پاس آیا تو اس کی برائی نہیں بیان کی (بلکہ اس کی خاطر و مداراۃ کی)

ایسا کیوں کیا اور جس طرح اس کے پیچھے اس کی برائی بیان فرماتے تھے اس کے سامنے بھی اس کو برا کیوں نہیں کہا؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول "جس سے لوگ اس کی برائی کے خوف سے الگ رہا کریں" کی شرح میں لکھا کہ کیلا یودیھم بلسانہ ب فیہ رخصتہ المداراۃ لدفع الضرر تاکہ وہ شخص لوگوں کو اپنی بدزبانی سے اذیت نہ پہونچائے۔ اور اس حدیث میں اس بات کی اجازت ہے کہ ضرر و نقصان سے بچنے کے لیے برے شخص کی خاطر مداراۃ کی جائے۔ قال القرطبی فیہ جواز غیبۃ المعلنین بالفسق او الفحش و نحو ذلک مع جواز مداراتھم اتقاء شرھم یعنی علامہ قرطبی نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے ثابت ہوا کہ جو لوگ علانیہ فسق یا بازبانی وغیرہ کرتے ہیں ان کی غیبت جائز ہے اور پھر (وہ سامنے آجائیں تو) ان کی شرارت سے بچنے کے لیے (تقیہ کے طور پر) ان کی خاطر مداراۃ کرنی بھی جائز ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ مطبوعہ مصر جلد ۴ ص ۶۲۸)۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بدمعاش شخص کی شرارت یا بدزبانی کے ڈر سے اس کی خاطر و مداراۃ کی حالانکہ اس کے پیچھے حضرت ہی اس کی غیبت (برائی) کر چکے تھے۔ اور یہی تقیہ ہے۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھا کام کرنے والوں پر دوسرے لوگ اعتراض کرتے ہی ہیں۔ چنانچہ ① صلح حدیبیہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقیہ کیا تو حضرت عمر نے اعتراض کیا۔
② حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شروع اسلام میں حضرت ابوبکر اعتراض کرتے تھے کہ آپ اپنے نئے دین کو ظاہر کیوں نہیں فرماتے ہیں جس سے مجبور ہو کر حضرتؐ نے اپنا دین ظاہر کر دیا۔ اور ③ اس بدمعاش شخص کی حضرتؐ نے برائی کی اور پھر اس کے سامنے اس کی خاطر مداراۃ کی تو حضرت عائشہ نے اعتراض کیا۔

④ بالکل اسی طرح شیعوں پر بھی حضرات اہل سنت اعتراض کرتے اور ان کے تقیہ پر دن رات منہ آتے ہیں پس جس طرح حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر اعتراض کرنے والے غلطی پر تھے اسی طرح شیعوں یا ان کے تقیہ پر منہ آنے والے بھی خطا پر ہیں اور شیعہ ہر حیثیت میں حق پر ہیں۔

چوتھی دلیل۔ امام بخاری صاحب نے لکھا ہے: عن عائشہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان رسول اللہ قال لھا الم تری ان قومك حین بنوا الکعبة اقتصروا عن قواعد ابراھیم فقلت یارسول اللہ الا تردّھا علی قواعد ابراھیم ۔ قال لولا حدثان قومك بالکفر لفعلت۔ و فیه ایضاً عن عائشه قالت قال لی رسول اللہ لولا حداثة قومك بالکفر لنقضت الکعبة ثم لبنیته علی اساس ابراھیم فان قریشا استقصرت بناءہ و جعلت له خلفا انتھی یعنی حضرت عائشہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ) بیان کرتی تھیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ تم نہیں دیکھتی ہو کہ تمہاری قوم نے جب خانہ کعبہ کو بنایا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کے پایوں کو جتنا رکھا تھا اس سے چھوٹا کر دیا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ کیوں نہ ان پایوں کو اسی طرح پھر بنوا دیں جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بنوائے تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا اگر تمہاری قوم کے کفر کا زمانہ ابھی تازہ نہ گذرا ہوتا (بلکہ ان کے کفر کا زمانہ پرانا ہوچکا ہوتا اور اسلام پر ایک مدت دراز گذر گئی ہوتی) تو میں واقعاً خانہ کعبہ کو گرا کر از سر نو بنواتا۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ کہتی تھیں کہ مجھ سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تمہاری قوم کے کفر کا زمانہ تازہ نہ گذرا ہوتا تو خانہ کعبہ کو توڑ کر اس کو پھر سے حضرت ابراہیمؑ کی نیو پر بنوا دیتا کیونکہ قریش نے اس کی بنیاد

چھوٹی کردی اور میں اس میں دروازہ بھی بنا دیتا۔ (صحیح بخاری کتاب المناسک باب فضل مکہ پارہ ٦ ص ٩٨)

اس روایت سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت رسول خداؐ نے تقیہ کیوجہ سے یعنی حضرت عائشہ کی قوم کے خوف سے نہ خانہ کعبہ کو منہدم کرایا نہ دوبارہ حضرت ابراہیمؑ کی نیو پر بنوایا ا۔

پانچویں دلیل۔ حضرت رسول خدا صلعم کو باوجودیکہ یقینی طور پر معلوم تھا کہ منافقین دینی امور میں بڑی بڑی خرابیاں ڈالیں گے پھر بھی حضرتؐ نے ان سے تقیہ کیا اور ان کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ چنانچہ قاضی عیاض نے لکھا ہے: **وترکہ قتل المنافقین وھو علی یقین من امورھم موالفۃ لغیرھم ورعایۃ للمومنین من ثرابتھم وکراھۃ لان یقول الناس ان محمدا یقتل اصحابہ کما جاء فی الحدیث** یعنی اگرچہ حضرت رسول خداؐ کو منافقین کے حالات سے یقین تھا کہ یہ لوگ اسلام میں بڑے بڑے فساد کریں گے مگر حضرت نے ان منافقین کو قتل نہیں کرایا اس خیال سے کہ ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ ہموار ہوں اور ان منافقین سے جن مسلمانوں کو قرابت ہے ان کی خاطرداری کیجائے (یعنی ان مسلمانوں کے لحاظ سے حضرتؐ نے ان کے رشتہ

ا۔ اس امر کے متعلق جناب شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اپنی کتاب تحفہ اثنا عشریہ میں یہ جو گمان کیا ہے کہ بناء کعبہ بر قواعد ابراہیم از مصالح دینوی بود و بالاجماع مامور بہ و واجب نبود (یعنی خانہ کو حضرت ابراہیمؑ کے پایوں پر بنوانا دینوی مصلحتوں سے حضرت کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی مذہبی کام نہیں تھا نہ خدا نے اس کا حکم دیا تھا نہ یہ واجب تھا) تو یہ گمان بالکل غلط اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ علامہ محب الدین سلیمانی البغدادی ثم الطوفی نے جو اعاظم اہل سنت سے ہیں کتاب شرح الاربعین میں ان مقامات کو گنا ہے جنہیں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینوی مصلحتوں کی وجہ سے ضروری احکام کی مخالفت کی یا ان احکام کو چھوڑ دیا یا موقوف کردیا۔ ان مقامات میں اس کو بھی لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہ سے فرمایا لولا قومك حدیث عھد بالاسلام لھدمت الکعبۃ وبنیتھا علی قواعد ابراھیم وھو یدل علی ان بناءھا علی قواعد ابراھیم ھو الواجب فی حکمھا فترکہ لمصلحۃ التالیف (باقی حاشیہ صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ ہو)

دار منافقین کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اگر حضرتؑ ان منافقین کو قتل کر دیتے تو ان مسلمانوں کو رنج ہوتا) اور لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ دیکھو اب محمدؐ اپنے صحابہ کو بھی قتل کر رہے ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے (شفاء ص) اور نسیم الریاض شرح شفاء جلد ۴ صفحہ ۳۳۲ میں اس جملہ وھو علی یقین من امورھم کے بعد یہ لکھا ہے باخبار اللہ تعالیٰ لہ بہ وبما یظھر من احوالھم من ایذائہ وما یبلغہ عنھم بما ظھر الآن اقتضیٰ کفرھم و زندقتھم و قتلھم یعنی قاضی عیاض نے یہ جو لکھا ہے کہ "اگرچہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کے حالات کا یقین تھا" تو یہ یقین اس وجہ سے تھا کہ خود خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کی ان باتوں سے مطلع کر دیا تھا اور وہ منافقین اپنی جن جن شرارتوں سے آنحضرتؐ کو اذیت پہنچاتے تھے ان سے بھی حضرتؐ پر ان کے فسادات ظاہر ہوتے رہتے تھے اور ان کی وہ باتیں بھی حضرت کو معلوم ہوتی رہتی تھیں جو اگر آج ظاہر ہوں تو یقینی طور پر ثابت ہو جائے کہ وہ کافر اور زندیق تھے اور ان کا قتل واجب تھا۔

پھر قاضی عیاض کے اس قول کما جاء فی الحدیث کے بعد اس شرح شفاء جلد ۴ ص ۳۳۲ میں یہ لکھا ہے کہ الذی رواہ البخاری فی عبد اللہ بن ابی ابن سلول لما قال فی غزوۃ بنی قینقاع لیخرجن الاعز منھا الاذل و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷)

یعنی اے عائشہ اگر تمہاری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوتی تو میں خانہ کعبہ کو گرا کر حضرت ابراہیمؑ کی نیو پر بنوا دیتا۔ پس حضرت کا یہ قول بتاتا ہے کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ کی نیو پر بنوانا ہی واجب تھا مگر حضرتؐ نے اس واجب کام کو صرف ان تازہ مسلمانوں کے تالیف قلب کے خیال سے چھوڑ دیا انتہی' (شرح اربعین) اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ کا حضرت ابراہیمؑ کی نیو پر بنوانا واجب تھا لیکن حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تالیف قلب کی مصلحت سے اس مذہبی واجب کام کو ترک کیا

بلغه صلی الله تعالی علیه وسلم ذلك فقال بعض الصحابة نقتله لنفاقه فقال صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فکیف اذا تحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه یعنی قاضی عیاض نے جولکھا ہے کہ "جیسا کہ حدیث میں آیا ہے" تو وہ حدیث یہ ہے جس کو امام بخاری نے عبداللہ بن ابی سلول کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے غزوہ بنی قینقاع میں کہا تھا کہ جوفرقہ غالب آجائے گا وہ مدینہ سے مغلوب فرقہ کو نکال دے گا۔ (یعنی کفار فتح پائیں گے اور مدینہ سے مسلمانوں کو باہر کردیں گے) اس کی خبر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ گئی تو بعض صحابہ نے حضرتؐ سے کہا کہ یا حضرتؐ: عبداللہ بن ابی سلول منافق ہے حضور اس کو قتل کردیں۔ حضرتؐ نے جواب دیا میں کیونکر ایسا کروں پھر تو لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے صحابہ کو بھی قتل کرنے لگے) نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض۔ جلد ۴ ص ۳۳۲)۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے بھی خلفاء ثلاثہ سے اسی وجہ سے جنگ نہیں کی کہ اس وقت وہ مسلمان جو تازہ اس دین میں داخل ہوئے تھے کہتے کہ مسلمان تو آپس ہی میں جنگ کررہے ہیں (پھر ہم لوگ کیوں اس مذہب پر باقی رہیں) اوراسلام کو چھوڑ دیتے اور بڑے بڑے فتنہ بپا ہوجاتے۔

چھٹی دلیل۔ علامہ ابن روز بہان نے لکھا ہے: لما بعث رسول الله واستولی الکفار علے المسلمین وضعت امر الاسلام واختفی رسول اللهؐ فی بیت الارقم مخافة سطوة الکفار ولم یقدر احد ان یظهر الاسلام دعی رسول اللهؐ اللهم اعز الاسلام بأبی الحکم او بعمر بن الخطاب فوقع الدعاء له فاسلم عمر صبیحة دعا فیها رسول الله و دخل علی رسول اللهؐ وهو کمل الاربعین لان باسلامه تکمل عدد

المسلمین باربعین وقال لرسول اللہؐ یارسول اللہ اللات والعزی یعبد ان علانیہ ویعبد اللہ سرا یعنی جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے تو کافر مسلمانوں (کے دشمن ہوکران) پر حاوی ہوگئے اس وقت اسلام کا حال اس قدر کمزور ہورہا تھا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں کے حملہ کے خوف سے ارقم کے گھر میں چھپ گئے تھے اور کسی شخص کو اس کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ اسلام ظاہر کر سکے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ تو ابوجہل یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ سے اسلام کو غلبہ دے۔ آنحضرتؐ کی یہ دعا عمر کے بارے میں قبول ہوگئی اس طرح کہ جس رات کو آنحضرتؐ نے یہ دعا کی اس کی صبح ہی کو عمر مسلمان ہوکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہی چالیس چالیس کی عدد پوری کرنے والے ہوئے کیونکہ ان کے اسلام سے مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔ پھر انہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ اے رسول خداؐ لات وعزیٰ کی پرستش تو کھلم کھلا ہوتی ہے اور اللہ کی عبادت چھپ کر کی جائے؟ (ابطال الباطل والفاروق ص ۳۳) اس کلام سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی مقرر ہونے کے بعد صرف کافروں کے حملہ کے خوف سے ارقم کے گھر میں چھپ رہے تھے اور کسی شخص کو اسلام ظاہر کرنے کی قدرت نہیں ہوتی تھی اور یہی تقیہ ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باوجود سب سے زیادہ بہادر اور قوی ہونے کے کافروں سے ڈرے اور ارقم کے گھر چھپ گئے اور حضرت عمر کے اسلام لاتے وقت تک شعائر اسلام کو پوشیدہ رکھا۔ حالانکہ محض لوگوں کی ہدایت ہی کے لیے حضرت مبعوث ہوئے تھے۔

ساتویں دلیل ۔ مشہور مورخ علامہ حسین دیار بکری نے لکھا ہے: فی المنتقی، وکان حمزۃ بن عبد المطلب اسلم یوم ضرب ابوبکر وذلک

ان اصحاب رسول اللہ و رضی عنہم لما اجتمعو او کانو تسعۃ وثلثین رجلا الح علی رسول اللہؐ فی الظھور۔ فقال یا ابابکر انا قلیل فلم یزل یلح علیہ حتی ظھر رسول اللہؐ فی نواحی المسجد وقام ابوبکر فی الناس خطیبا و رسول اللہؐ وثار المشرکون علی ابی بکر و علی المسلمین فضربوھم فی نواحی المسجد ضربا شدیدا اووطے ابوبکر و ضرب ضربا شدید و دنا منہ الفاسق عتبۃ بن ربیعۃ فجعل یضربہ بنعلین مخصوفین ویحرفھا بوجھہ واثر علے وجہ ابی بکر حتی ما یعرف انفہ من وجھہ

یعنی منتقی میں ہے کہ جس روز حضرت ابوبکر پیٹے گئے ہیں اسی روز حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے اسلام ظاہر کیا جس کا واقعہ یہ ہوا کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جو ۳۹ تھے اکٹھے ہوئے تو حضرت ابوبکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اصرار کیا کہ اب ہم لوگ اپنا مسلمان ہونا ظاہر کردیں۔ مگر آنحضرتؐ نے فرمایا اے ابوبکر ہم لوگ کم ہیں (ابھی ظاہر ہونا مناسب نہیں ہے) مگر حضرت ابوبکر نے آنحضرتؐ پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ آنحضرتؐ مجبور ہوکر مسجد کے ایک گوشہ میں ظاہر ہوگئے اور حضرت ابوبکر نے کھڑے ہوکر خطبہ بیان کرنا شروع کردیا۔ اس وقت آنحضرتؐ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابوبکر نے یہ پہلی دفعہ لوگوں کو خدا اور رسولؐ کی طرف بلانے کا خطبہ شروع کیا تھا جسے دیکھ کر مشرکین حضرت ابوبکر اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور مسجد کے گوشوں میں بری طرح ان لوگوں کو پیٹنے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر تو لاتوں سے روند ڈالے گئے اور ان پر بڑی ہی سخت مار پڑی۔ بلکہ بدمعاش عتبہ بن ربیعہ اپنی پیوند لگی ہوئی جوتیاں لے کر کھڑا ہوگیا اور اس سے ان کو مارنے لگا جس سے حضرت ابوبکر کا چہرہ

بگڑ گیا یہاں تک کہ معلوم ہوتا تھا آپ کی مسلم ناک ہی غائب ہو گئی کیونکہ کسی شخص کو آپ کے چہرے پر ناک کا پتا نہیں ملتا تھا۔ (تاریخ خمیس جلد ا صفحہ ۳۳۲) اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شروع میں تقیہ کرتے تھے کہ اپنے اعوان و انصار کی کمی کی وجہ سے دین اسلام کے ظاہر کرنے اور کافروں کو اس مذہب کی طرف دعوت کرنے سے ڈرتے تھے اور حضرت ابوبکر نے آنحضرت صلی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف عمل کیا اور آنحضرتؐ پر سبقت کر کے خطبہ بیان کرنے لگے تو اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

آٹھویں دلیل۔ ان حضرات کے مشہور اور بہت بڑے محدث علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ: ولاحمد وابی یعلی من طریق ابی حرب عن ابی الاسود عن عمه عن ابی ذر قال النبیؐ قال له کیف تصنع اذا اخرجت منه ای المسجد النبوی۔ قال آتی الشام۔ قال کیف تصنع اذا اخرجت منها قال اعود الیه ای المسجد۔ قال کیف تصنع اذا اخرجت منه قال اضرب بسیفی۔ قالؐ الا ادلك علی ما هو خیر لك من ذلك واقرب رشد التسمع و تطیع و تنساق لهم حیث ساقوك یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ (ابوذر) سے فرمایا کہ بتاؤ جب تم کو لوگ اس مسجد نبوی سے جلا وطن کر دیں گے تو کیا کرو گے؟ میں نے عرض کی ملک شام کی طرف چلا جاؤں گا۔ حضرتؐ نے فرمایا جب وہاں سے بھی شہر بدر کر دیئے جاؤ گے تو کیا کرو گے۔ عرض کی تب پھر حضورؐ کی مسجد (مدینہ) کی طرف لوٹ آؤں گا۔ حضرتؐ نے فرمایا جب اس سے بھی دوبارہ نکال دیئے جاؤ گے تو کیا کرو گے۔ میں نے عرض کی کہ اس وقت میں اپنی تلوار کھینچ لوں گا اور ان لوگوں کو مارنا شروع کروں گا۔ آنحضرتؐ

نے فرمایا میں وہ چیز نہ بتا دوں جو تمہارے لئے بہتر اور زیادہ نفع بخش اور تمہاری بھلائی کے لئے بہت مفید ہے۔ اور وہ یہ کہ تم ان (ظالموں) کی بات مان لینا۔ ان کی اطاعت کرلینا اور جہاں وہ تمہیں نکالیں نکل کر چلے جانا (فتح الباری شرح صحیح بخاری مطبوعہ دہلی پارہ ۶ ص ۱۵)

اس روایت کا مطلب بالکل صاف ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریح حدیث میں جناب ابوذر جیسے جلیل القدر صحابی کو حکم دیا کہ جب حضرت عثمان ان پر ظلم و جور کریں اور مسجد نبوی سے نکال دین اور وہ شام چلے جائیں۔ اور وہ لوگ آپ کو شام سے بھی نکال دیں اور آپ دوبارہ مسجد نبوی (مدینہ) میں آئیں اور پھر مدینہ سے نکالے جائیں تو جناب ابوذرؓ تقیہ کرلیں اور جہاں وہ لوگ آپ کو پہنچائیں چلے جائیں۔ کوئی عذر نہ کریں۔ نہ لڑیں نہ خونریزی کریں۔ علامہ ابن حجر نے صحیح بخاری کی اس حدیث کی شرح میں جو جناب ابوذر کے جلاوطن کئے جانے کے متعلق ہے لکھا ہے: بیہ التحذیر من الشقاق والخروج علے الائمته والترغیب فی الطاعة لاولی الامر وامر الافضل بطاعة المفضول خشیة المفسدة یعنی اس حدیث میں لوگوں کو آپس میں اختلاف کرنے اور خلفاء وقت کے خلاف خروج کرنے سے ڈرایا ہے اور اس بات کی ترغیب دلائی ہے کہ حاکموں کی اطاعت کیا کریں اور افضل کو حکم دیا ہے کہ فتنہ وفساد کے ڈر سے مفضول کی اطاعة کرلیا کریں۔ (فتح الباری پارہ ۶ ص ۱۵)

نویں دلیل۔ امام مسلم نے تحریر فرمایا ہے: عن ابی هریرة ان رسول الله قال لم یکذب ابراهیم النبی علیه السلام قط الاثلث کذبات ثنتین فی ذات الله قوله سقیم و قوله بل فعله کبیرهم هذا۔ وواحدة فی شان سارة فانه قدم ارض جبار و معه سارة وکانت احسن الناس

فقال لها ان هذا الجبار ان علم انك امر ءتی یغلبنی علیك فان سالك فاخبریه انك اختی فی الاسلام فانی لا اعلم فی الارض مسلما غیری و غیرك یعنی جناب ابوہریرہ سے روایت ہے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم نبی علیہ السلام تین جھوٹ کے سوا کبھی غلط نہیں بولے۔ اس تین جھوٹ میں سے دو جھوٹ تو خدا کی راہ میں تھا اور ایک اپنے بارے میں خدا کی راہ میں تو آپ نے فرمایا: انی سقیم میں بیمار ہوں (حالانکہ آپ بیمار نہیں تھے) اور فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے بت نے کیا ہے (حالانکہ اس بڑے بت نے کچھ نہیں کیا تھا) اور تیسرا جھوٹ اپنے بارے میں یہ تھا کہ حضرت اپنی زوجہ جناب سارہ کے ساتھ ایک ظالم بادشاہ کے ملک میں پہنچے۔ جناب سارہ بہت ہی خوب صورت تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان سے فرمایا کہ دیکھو یہاں کا بادشاہ اگر جان لے گا کہ تم میری بیوی ہو تو وہ ضرور تم کو مجھ سے چھین لے گا۔ پس اگر وہ تم سے پوچھے کہ کون ہو تو کہہ دینا کہ میں ان کی بہن ہوں۔ اور اسلامی حیثیت سے تم میری بہن ہو بھی کیونکہ اس وقت پردۂ دنیا پر میرے اور تمہارے سوا کوئی بھی مسلمان نہیں ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۶)

شارح شفاء نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ کو یہ کیوں سکھایا کہ تم اپنے کو میری بہن بتا دینا پھر اس کی وجہ وہ خود لکھتے ہیں: قال تقیۃ خشیۃ ان یقتله لو قال انها زوجتی یعنی حضرت ابراہیمؑ نے تقیہ کی وجہ سے یہ بات اپنی زوجہ کو سکھائی کیونکہ وہ ڈرے کہ اگر وہ اس بادشاہ سے کہہ دیں گے کہ یہ میری زوجہ ہیں تو وہ بادشاہ ان کو قتل کر ڈالے گا۔ اور علامہ نواوی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے اس کی کئی تاویلیں کی ہیں۔ دوسری تاویل کے بیان میں لکھا ہے: الوجه الثانی انه لو کان کذا لا توریة فیها لکان جائزا

فی دفع الظالمین ۔ قد اتفق الفقهاء علی انه لو جاء ظالم یطلب انسانا مختفیا لیقتله و یطلب ودیعة لانسان لیاخذ ها غصبا و سال عن ذلك وجب علی من علم ذلك اخفائه وانكار العلم به و هذا الكذب جائز بل واجب لكونه فی دفع الظلم عنه ۔ فنبّه النبیؐ علی ان هذه الكذبات لیست داخلة فی مطلق الكذب المذموم

یعنی اس کی تاویل کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ایسا جھوٹ ہو جس میں توریہ نہ ہو سکے تو ظالموں کے دفع کرنے کے لئے یہ جھوٹ جائز ہے۔ چنانچہ علماء و فقہاء کا اس فتویٰ پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی آدمی کو قتل کرنے کے لئے ڈھونڈتا آئے اور وہ آدمی اس ظالم سے چھپ گیا ہو۔ یا وہ ظالم کسی آدمی کی امانت تلاش کرتا آئے تا کہ اس کو چھین لے اور اس آدمی یا اس امانت کے بارے میں لوگوں سے پوچھے کہ کہاں ہے بتاؤ تو جس شخص کو اس کے چھپے ہوئے آدمی یا امانت کی خبر ہو اس پر واجب ہے کہ کسی کا پتہ نہ بتائے بلکہ اس کو چھپائے رہے اور صاف کہہ دے کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہے اور یہ جھوٹ جائز بلکہ واجب ہے کیونکہ اس جھوٹ کی غرض صرف یہ ہے کہ اس سے اس ظالم کا ظلم رک جائے اور وہ اپنے بُرے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تنبیہ کردی کہ حضرت ابراہیم جو تین جھوٹ بولتے وہ اس جھوٹ میں داخل نہیں ہے جو عام طور پر برا اور ناجائز ہے۔ (شرح نواوی جلد ۲ ص ۲٦۷) اـ

اـ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے: وعلی تقدیرہ فلم یصدر ذلك من ابراهیمؑ یعنی اطلاق الكذب علی ذلك الا فی حال شدة الخوف لعلو مقامه والا ت فالكذب المحض فی مثل تلك المقامات یجوز وقد یجب لتحمل اخف الضررین دفعا لا عظمهما۔ واما تسمیته ایاها كذبات فلا یرید انها تلم فان الكذب وان كان قبیحا مخلا لكنه قد یحسن فی مواضع و هذا منها۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مطلق جھوٹ بولے تب بھی حضرت (بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٦ پر)

دسویں دلیل۔ کتاب مشکوٰۃ میں ہے: عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ کیف انت اذا کانت علیك امراء یمیتون الصلوۃ او یوخرونها عن وقتها قلت فما تامرنی قال صلی اللہ علیه وسلم صل الصلوۃ لوقتها فان ادرکتها معهم فصل فانها لك نافلة رواہ مسلم (مشکوۃ جلد ۱ ص ۱۳۲) اور جناب شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اس حدیث کے ترجمہ میں لکھتے ہیں

گفت ابوذر گفت مرا پیغمبر خدا۔ چه گونه خواهد بود حال تو و چه خواهی کرد وقتے که مسلط خواهند گشت بر تو پادشاهان که در مخالفت ایشان اثارت فتنه است می مرانند نماز را و رعایت نمی کنند شرائط و آداب آنرا یا پس اندازند نماز ها را از اوقاتش یعنی از اوقات مختار و فاضل ابوذر می گوید گفتم من که چه می فرمائی مرا و چه کنم گفت آنحضرت بگزار نماز را در وقتش پس اگر دریابی نماز را بایشان نیز بدرستی نمازے که همراه ایشان بگزاری نفل خواهد بود برائے تو وازیں جا معلوم شود که اگر امام تاخیر کند در وقت نماز خصوصاً که بوقت مکروہ اندازد ماموم را باید که بگزارد

(بقیہ حاشیہ ص ۶۵)

خوشی سے نہیں بولے بلکہ شدید خوف کی حالت میں بدرجہ مجبوری حضرت کو جھوٹ بولنا پڑا کیونکہ حضرتؑ کی شان اس سے بلند تھی کہ بے وجہ جھوٹ بولتے اور اگر یہ بات نہ مانی جائے (کہ حضرت ابراہیمؑ نے بدرجہ مجبوری شدید خوف کی حالت میں جھوٹ بولے بلکہ اسی پر اصرار کیا جائے کہ حضرتؑ سچ بول سکتے تھے) تب بھی محض جھوٹ ایسے مقامات پر جائز ہے بلکہ کبھی واجب بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص مجبور ہوجائے کہ اگر جھوٹ نہ بولے گا تو اس سے بڑے گناہ میں مبتلا ہوجائے گا۔ ایسی صورت میں اس پر واجب ہے کہ جھوٹ بولے تاکہ اس بڑے گناہ سے بچا رہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ پھر ایسی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کیوں فرمایا تو حضرت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے برا کام کیا جس کی وجہ سے ان کی مذمت کی جائے یا آپ پر اعتراض ہو۔ اس لئے کہ جھوٹ اگرچہ برا ہے مگر بعض مقاموں پر اچھا کام بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ویسا ہی ہے (فتح الباری پارہ ۱۳ ص ۲۳۲) غرض حضرت ابراہیمؑ اگر تقیہ کر کے جناب سارہ کو اپنی بہن نہ کہتے تو وہ ظالم بادشاہ ان کو چھین لیتا اس وجہ سے حضرتؑ کا فرض وہی تھا جو آپ نے کیا جس سے تقیہ کا جائز ہونا مثل آفتاب کے روشن ہوگیا۔

نماز خود را در اول وقت پستر گزارد با امام تا فضیلت وقت و جماعت هر دو یابد و این در غیر نماز فجر و عصر و مغرب خواهد بود از جهت کراهت تنفل درآں وقت و عدم مشروعیت نفل سه رکعت یا آں که ارتکاب این مکروه اهون است از اثارت فتنه و اختلاف کلمه که لازم آید از مخالفته امراء جائز انتہی۔

دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ مجھ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے ابوذرؓ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا اور کیا کرو گے جب تم پر بادشاہان وقت مسلط ہوجائیں گے جن کی مخالفت میں فتنہ وفساد برپا ہوگا۔ وہ لوگ نماز کو مردہ کردیں گے اور اس کی شرائط وآداب کا لحاظ نہیں رکھیں گے یا ان نمازوں کو ان کے اوقات سے پیچھے کردیں گے یعنی جو فضیلت کا وقت ہوگا اس کو چھوڑ کر آخروقت پڑھیں گے۔ جناب ابوذرؓ کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ حضور مجھے کیا حکم دیتے ہیں اور میں اس وقت کیا کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی نماز کو اول (فضیلت) ہی کے وقت پڑھتے رہنا۔ ہاں اگر دیکھو کہ وہ آخروقت نماز پڑھ رہے ہیں تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہی نماز کو پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ نماز جو ان بادشاہوں یا حاکموں کے ساتھ پڑھو گے تمہاری سنتی نماز محسوب ہوجائے گی۔ اور اس جگہ سے معلوم ہوا کہ اگر امام نماز پڑھنے میں دیر کرے خصوصاً اتنی تاخیر کہ مکروہ وقت میں اس کی نماز ہو تو ماموم کو چاہیے کہ اپنی نماز کو اول وقت میں ہی پڑھ لے۔ پھر امام کے ساتھ بھی جماعت کی پڑھ لے تاکہ اس کو اول وقت نماز پڑھنے کا ثواب بھی ملے اور نماز جماعت کا بھی۔ اور یہ صورت نماز صبح وعصر ومغرب کے علاوہ اوقات (یعنی نماز ظہر ونماز عشا) میں

ہوسکتی ہے کیونکہ اسوقت سنتی نماز پڑھنی مکروہ ہے اور تین رکعت (مغرب کی جو امام کے ساتھ دوبارہ پڑھی جائے گی یہ نماز بھی سنتی نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس مکروہ عبادت کا انجام دینا بہتر ہے اس سے کہ ظالم حاکموں کی مخالفت کر کے فتنہ و فساد پیدا کیا جاوے اور مسلمانوں میں اختلاف پھیلے۔ انتہیٰ۔

اس حدیث سے صاف طور پر تقیہ کا جائز ہونا ثابت ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو حکم دیا کہ اپنے وقت کے حاکموں کی مخالفت نہ کریں اور ان کی مکروہ وقت کی نمازوں میں شریک ہوکر اپنی جان بچائیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خلفاء ثلاثہ بھی حکام جور اور اوقات نماز کو ضائع کرنے والے تھے۔ اس لئے کہ حضرت ابوذرؓ انہیں تینوں خلفاء کے زمانہ میں تھے اور سوا ان حضرات کے اور کوئی ان کا حاکم نہیں تھا۔ پس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث میں جن حاکمان وقت کی طرف اشارہ کر کے ان کو ظالم حکام کہا اور جناب ابوذرؓ کو ان کا ساتھ دینے کی تاکید کی وہ یہی خلفاء ثلاثہ تھے۔ اور مشکوۃ میں یہ بھی لکھا ہے: عن قبیصۃ بن وقاص قال قال رسول اللہ یکون علیکم امراء من بعدی یوخرون الصلوۃ فھی لکم وھی علیھم فصلوا معھم ما صلوا القبلۃ رواہ ابو دائود اور جناب شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اس حدیث کے ترجمہ میں لکھتے ہیں "می باشند مسلط و غالب بر شما پادشاهان پس از من تاخیر می کنند نماز را از وقت مختار پس ثواب آں نماز که ایشاں می گزرند ونفع آں برائے شما است چرا که پیش ازاں در وقتش گزارده اید این نماز که با ایشاں می گزارید نیز شما را ضرر ندارد و زیرا که شما بجهة خوف فتنه و دفع مفسده می گزارید وضرر این نماز و وبال تاخیر بر گردن او شاں است پس بگزارید نماز همراه ایشاں

مادام که به گزارند بجانب قبله۔

یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے بعد تم لوگوں پر ایسے حاکم اور بادشاہ مسلط ہوجائیں گے جو نمازوں کو بہت دیر کر کے پڑھا کریں گے تو جو نمازیں وہ لوگ پڑھیں گے اس کا بھی ثواب اور نفع تم لوگوں کو ملیگا۔ اس لئے کہ تم لوگ اپنی اپنی نمازوں کو اول وقت میں پڑھ لوگے۔ اور پھر ان کے ساتھ جو پڑھو گے تو وہ تمہارے لئے نافلہ ہوجائیں گی۔ اور اگر تم لوگوں نے اپنی نمازیں پہلے نہیں پڑھی ہوں گی بلکہ ان بادشاہوں کے ساتھ ہی اپنی واجبی نماز کو ادا کرو گے جب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا اس لئے کہ تم لوگ تو ان بادشاہوں کے خوف اور فتنہ و فساد کے ڈر سے ان بادشاہوں کے ساتھ آخر وقت میں نماز کو پڑھو گے (جس کی وجہ سے تمہاری مجبوری ظاہر ہوگی) ہاں ان نمازوں کو دیر کر کے پڑھنے کا نقصان اور وبال جو کچھ ہوگا وہ سب انہیں بادشاہوں کی گردن پر ہوگا۔ لہٰذا تم لوگ بے تکلف ان بادشاہوں کے ساتھ اپنی نمازیں پڑھتے رہنا بشرطیکہ وہ لوگ ان نمازوں کو قبلہ ہی کی طرف پڑھیں (مشکوۃ جلد ۱ ص ۱۳۶)

گیارہویں دلیل۔ حضرات اہل سنت کہتے ہیں کہ جناب زینب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی تھیں اور یہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس زینب کی شادی اسلام سے پہلے ابوالعاس کے ساتھ ہوئی تھی جو کافر تھا مگر جب حضرت نے لوگوں پر دین اسلام پیش کیا اور ابوالعاص مسلمان نہیں ہوا۔ جب بھی کافروں کے ڈر سے آنحضرت صلعم نے اپنی بیٹی زینب کو اس کافر سے الگ نہیں کیا اس لئے کہ اس وقت کافروں کا زور تھا اور مسلمان کمزور تھے۔ حالانکہ اگر آنحضرت کو قدرت ہوتی تو جناب زینب کو اس کافر سے ضرور علیحدہ کرا دیتے۔

جیسا کہ علامہ دیار بکری نے جناب زینب کے حالات میں لکھا ہے کہ: قد تقدم انہا اکبر بناته بلا خلاف الا مالا یصح وانما الخاوف فیها وفی القاسم ایهما ولد اولا۔ قال ابن اسحاق سمعت عبداللہ بن محمد بن سلیمان یقول ولدت زینب بنت رسول اللہ فی سنة ثلثین من مولدہٗ وادرکت الاسلام و اسلمت و هاجرت وکان رسول اللہ محبا فیها۔ ذکر من تزوجها کان تزوجها ابن خالتها ابوالعاص بن ربیع بن عبدالعزی بن عبدشمس بن عبدالمناف فی الجاهلية واسمه لقیط و علیه الاکثر و قیل هیثم و قیل محثم۔ عن عائشه قالت کان ابوالعاص من رجال مکة المعدودین مالا و تجارة و امانة۔ فقالت خدیجة لرسول اللہ زوجه و کان رسول اللہؐ لا یخالفها و ذلك قبل ان ینزل علیه فروجه زینب۔ فلما اکرم اللہ نبیه بنبوته آمنت خدیجة و بناته فلما نادی قریشا بامر اللہ تعالی اتوا اباالعاص بن ربیع فقالو افارق صاحبتك ونحن نزوجك بای امراة شئت من قریش فقال لا واللہ لا ان افارق صاحبتی ومایسرنی ان لی بامراتی افضل امراءة من قریش عن عائشه قالت کان الاسلام فرق بین زینب و بین ابی العاص الا ان رسول اللہ لا یقدر ان یفرق بینهما و کان مغلوبا بمکة یعنی پہلے یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جناب زینب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوائے اس اختلاف کے جو کسی طرح صحیح نہیں ہے (یعنی اگر اس میں اختلاف ہے بھی تو وہ غلط ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا) البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جناب زینب اور آنحضرتؐ کے فرزند جناب قاسم میں کون بڑا تھا (جناب زینبؑ جناب قاسم

سے بڑی تھیں یا جناب قاسم جناب زینب سے بڑے تھے) ابن اسحاق کہتے تھے کہ میں نے عبداللہ بن محمد بن سلیمان سے سنا کہ جناب رسول خدا ﷺ کی ولادت کے تیسویں سال حضرتؐ کی بیٹی جناب زینب پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسلام کا زمانہ پایا خود مسلمان ہوئیں اور مدینہ کو ہجرت بھی کی اور آنحضرتؐ ان کو دوست رکھتے تھے اور ان کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص کے ساتھ زمانہ جاہلیت ہی میں ہوئی تھی۔

اس ابوالعاص کا نام لقیط یا ہیثم یا مہثم تھا (اور ابوالعاص کنیت تھی) حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ ابوالعاص مکہ کے ان لوگوں میں تھا جو اپنے مال تجارت اور امانت کی وجہ سے ممتاز اور مشہور تھے۔ پس حضرت خدیجہؓ نے حضرت رسول خدا ﷺ سے فرمایا کہ زینب کی شادی اسی ابوالعاص سے کر دیجئے۔ اور آنحضرتؐ جناب خدیجہؓ کو اس قدر مانتے تھے کہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے تھے اور یہ بات حضرتؐ پر وحی نازل ہونے سے قبل کی ہے۔ غرض حضرت رسول خدا ﷺ نے جناب زینب کی شادی ابوالعاص سے کردی۔ پھر جب آنحضرت ﷺ کو خدا نے خلعت نبوت سے سرفراز فرمایا تو جناب خدیجہؓ اور آپ کی بیٹیوں نے بھی ایمان قبول کرلیا۔ مگر جب آنحضرت ﷺ نے قریش کو اسلام کی طرف دعوت دی اور حکم خدا کی طرف بلایا تو کفار قریش ابوالعاص کے پاس آئے اور اس سے اصرار کرنے لگے کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو اس کے عوض پورے قبیلہ قریش کی جس لڑکی سے کہو ہم لوگ تمہاری شادی کر دیتے ہیں۔ ابوالعاص نے جواب دیا نہیں خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا میری بیوی کے عوض اگر قریش کی سب سے افضل و اعلیٰ عورت بھی مجھے مل جائے تب بھی مجھے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔

حضرت عائشہ بیان فرماتی تھیں کہ اسلام نے حکم کے اعتبار سے جناب زینب اور ابوالعاص کے درمیان جدائی کر دی تھی مگر حضرت رسول خدا ﷺ اس پر قادر نہ ہو سکے کہ عملی طور پر جناب زینب کو ابوالعاص سے الگ کر دیں کیونکہ مکہ معظمہ میں آنحضرتؐ ہر طرح مغلوب تھے اور کفار قریش کا زور تھا (تاریخ خمیس جلد ا ص ۳۰۸) اس عبارت سے بفضلہٖ تعالیٰ معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا ﷺ اپنی بیٹی کو جو مسلمان تھیں ان کے شوہر ابوالعاص سے جو کافر تھے اپنی کمزوری اور مغلوبیت کی وجہ سے الگ نہ کر سکے اور حضرتؐ کو اس کی قدرت نہ ہو سکی کہ دونوں کے درمیان جدائی کرا دیں حالانکہ اسلام کا حکم یہی تھا کہ جدائی کرا دی جائے۔ پس حضرت رسول خدا ﷺ کا یہ فعل صاف تقیہ تھا۔

اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: زینب بنت سید ولد آدم محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب القریشۃ الہاشمیۃ ھی اکبر بناتہ و اول من زوج منہن۔ ولدت قبل البعثۃ بمدۃ قیل انھا عشر سنین واختلف ھل القاسم قبلھا او بعدھا۔ و تزوجھا ابن خالتھا ابوالعاص ابن الربیع الھیثمی وامہ ھالۃ بنت خویلد اخرج ابن سعد بسند صحیح عن الشعبی قال ھاجرت زینب مع ابیھا و ابی زوجھا ابوالعاص ان یسلم فلم یفرق النبی صلعم بینھما یعنی جناب زینب بیٹی تھیں سردار بنی آدم حضرت رسول خداؐ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کی اور قبیلہ قریش کے خاندان بنی ہاشم سے تھیں۔ یہی آنحضرت ﷺ کی بڑی بیٹی تھیں اور آنحضرتؐ کی پشت سے کئی سال پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ نبوت سے دس سال پہلے آپ کی ولادت ہوئی تھی اب اس میں اختلاف

ہے کہ آپ کے بھائی جناب قاسم آپ سے پہلے پیدا ہو چکے تھے یا آپ کے بعد متولد ہوئے۔ جناب زینب کی شادی آپ کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص سے ہوئی جس کی ماں ہالہ دختر خویلد تھیں۔ ابن سعد نے سند صحیح کے ساتھ شعبی سے روایت کی ہے کہ جناب زینب نے اپنے پدر بزرگوار حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی مگر ان کے شوہر ابوالعاص نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں (زینب اور ابوالعاص) میں جدائی نہیں کرا سکے۔ (اصابہ جلد ۸ ص ۹۱)

بارہویں دلیل۔ صحیح بخاری میں اس جگہ جہاں جناب سیدہؑ کے حضرت ابوبکر سے میراث طلب کرنے کی حدیث درج کی ہے لکھا ہے: فابی ابوبکر ان یدفع الی فاطمة منها شیئا فوجدت فاطمة علی ابی بکر فی ذلك فهجرته فلم تكلمه حتی توفیت و عاشت بعد النبی ﷺ ستته الشهر فلما توفیت دفنها زوجها علی رضی الله عنه لیلا ولم یوذن بها ابابکر وصلی علیها وکان لعلی من الناس وجه حیاة فاطمة ۔ فلما توفیت استنکر علی وجوه الناس فالتمس مصالحة ابی بکر و مبایعته ولم یکن بایع تلك الاشهر یعنی جب حضرت فاطمہ علیہا السلام نے حضرت ابوبکر سے اپنے پدر بزرگوار کی میراث طلب کی تو انہوں نے حضرت فاطمہؑ کو کوئی چیز دینا منظور نہیں کیا بلکہ سب سے انکار کر دیا اس پر جناب سیدہؑ حضرت ابوبکر سے اس درجہ رنجیدہ ہوئیں کہ ان سے تمام باتیں ترک کر دیں اور پھر مرتے وقت تک ان سے نہ بولیں۔ حالانکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد چھ مہینہ تک زندہ رہیں۔ جب حضرتؑ کا انتقال ہو گیا تو آپؑ کے شوہر حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے آپ کو رات ہی کے وقت دفن کر دیا اور حضرت ابوبکر کو جنازہ میں

شریک تک نہیں ہونے دیا اور خود نماز جنازہ بھی پڑھی مگر جناب سیدہؓ کی زندگی سے حضرت امیر المونینؑ کا وقار کچھ اور ہی تھا۔ جب آپ کا انتقال ہو گیا تو حضرت نے لوگوں کے چہروں کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ لہٰذا حضرت ابوبکر سے صلح پسند کرلی اور ان کی بیعت کرلی مگر اس سے پہلے چھ مہینہ تک بیعت نہیں کی تھی۔ (صحیح بخاری پارہ ۱۷ص ۱۷۱۔ کتاب المغازی باب غزوہ خیبر)

اس سے بھی تقیہ کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ حضرت امیر المومنینؑ حضرت ابوبکر کو خلیفہ نہیں مانتے تھے اس وجہ سے ان کی بیعۃ نہیں کی مگر جب چھ ماہ کے بعد جناب سیدہؓ کے انتقال سے حضرتؑ نے لوگوں کا رنگ بدلا ہوا پایا تو مصلحتاً مجبور ہو کر حضرت ابوبکر سے صلح اور بیعت بھی کرلی۔ ا؎

تیرہویں دلیل۔ جب یزید کے خلیفہ ہونے پر مدینہ والوں نے اس کی بیعت اپنی گردن سے نکال دی تو حضرت عمر کے صاحبزادے جناب عبداللہ بن عمر نے اپنے حشم و خدم اور اولاد و اقربہ کو جمع کر کے سب کو خوب سختی سے سمجھایا کہ یزید کی بیعت نہ چھوڑو چنانچہ صحیح بخاری میں ہے: عن نافع قال لما خلع اهل المدينة يزيد بن معويه جمع ابن عمر حشمه وولده فقال انی سمعت رسول الله يقول ينصب لكل غادر لواء يوم القيامة وانا قد بايعنا هذا الرجل على بيع الله ورسوله وانی لا اعلم غدرا اعظم من ان يبايع رجل على بيع الله ورسوله ثم ينصب له القتال وانی لا اعلم احدا منكم خلعه ولا تابع فی هذا الامر الا كانت الفصل بينی و بينه

ا؎ مگر یہ واضح رہے کہ حضرت علیؑ کا حضرت ابوبکر کی بیعت کرنا واقعاً صحیح نہیں ہے نہ یہ شیعوں کا اعتقاد ہے نہ شیعوں کی کسی کتاب سے کوئی صاحب اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔ صرف حضرات اہل سنت اس کا دعویٰ کرتے ہیں اور انہیں کی کتاب سے اوپر کی روایت لکھی گئی ہے۔ پس اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ان کو تقیہ کا جائز ہونا بھی ماننا پڑے گا ورنہ بتائیں کہ حضرت امیر المومنینؑ نے لوگوں کے چہروں کا رنگ بدلا ہوا پانے کے بعد کیوں بیعت کی؟ اگر حضرتؑ ان کو خلیفہ تسلیم کرتے تو پہلے ہی دن ان کی بیعت کر لیتے۔ ۱۲ مترجم

یعنی جب مدینہ والوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت اپنی گردن سے نکال دی تو حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے حشم اور اولاد کو اکٹھا کیا اور ان سب سے کہا کہ میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا وہ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن ہر غدر کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا اور ہم لوگ اس شخص (یزید بن معاویہ) کی بیعت خدا اور رسول کی بیعت کی طرح کر چکے ہیں اور میں کسی غدر کو اس سے بڑا اور عظیم الشان نہیں جانتا کہ کسی کی بیعت خدا اور رسول کی بیعت کی طرح کی گئی ہو پھر اس سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا سامان کیا جائے۔ اب تم میں سے جس شخص کے بارے میں مجھے معلوم ہوگا کہ اس نے یزید کی بیعت چھوڑ دی ہے اور اس امر میں موافقت نہیں کرتا اس سے میرے تمام تعلقات ختم ہو جائیں گے اور میں اس سے بالکل الگ ہو جاؤں گا۔ (صحیح بخاری پارہ ۲۹ ص ۵۵۶) اور حضرات اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے یزید کی بیعت کے لئے یہ سب کوششیں کی تھیں۔

چنانچہ حضرات اہل سنت کے مشہور عالم جناب مولوی رشید الدین خان صاحب نے اپنے بعض خطوط (یعنی جناب مولوی سبحان علی خان صاحب رحمہ اللہ نے جو استفسار کیا تھا اس کے جواب کی شرح میں لکھا ہے کہ: چوں متغلب معہود از اہل مدینہ اولا علی بیعۃ اللہ و الرسول علی ماجاء فی جامع الاصول اخذ صفقۃ نمودہ بود و بناء تغلب او از وقت پدرش پا در استحکام داد را بطرف اخذ بیعۃ از کرام اہتمام تمام داعوان اوباد نے شبہہ مخالفت سفک و ماء کہراء می نمودند ایں طریقہ در قوم او مستمر ماند تا ایں کہ ابن عمر نیز مثل دیگر اخیار با شا حجاج از دست ظالمے کہ سنان زہر آلود بپالیش خلا یند شربت شہادت چشید علی ما فی الاستیاب لابن عبدالبر د تاریخ الخلفاء للشیخ السیوطی

لهذا ابن عمر به بیعت اددرداد و از کشمکش اهل جور یکسو افتاد و بر مذاق
شیعه نیز بیعت محقین یا مبطلین بنا بر اسباب داعیه برآں واقع شده است
شریف مرتضی در تنزیه الانبیاء والائمه در ذکر حضرت امام حسن علیه
السلام می فرماید و اما البیعة فان ارید بها الصفقة واظهار الرضا والکف عن
المنازعة فقد کان ذلك لکنا قد بینا جهته وقوعه والاسباب الموجبة الیه ولا
حجة فی ذلك علیه کما لم یکن فی مثله حجة علی ابیه صلوات الله علیهما لما
بایع المتقدمین علیه و کف عن نزاعه منهم انتهی و از آنجا که خلع بیعت
مستلزم سفك و ماء است لهذا ابن عمر بوقت خلع اهل مدینه حشم و خدم
خود را جمع کرده از قتال زجر فرموده و عبدالله بن مطیع را نیز از خلع بیعة
منع نمود و قسطلانی در شرح صحیح بخاری گفته لعل معویه کان رایه فی
الخلافة تقدیم التفاضل فی القوة والمعرفة والرای علی الفاضل فی السبق الی
الاسلام والدین فلذا اطلق انه احق و رای ابن عمر خلاف ذلك وانه لا یبایع
المفضول الا اذا خشی الفتنة دور جائے دیگر بعد این عبارت گفته و لذا بایع
بعد ذلك معاویة ثم ابنه یزید ونهی اهل بیته عن نقض بیعته کما سیاتی
انشاء الله تعالیٰ فی الفتن انتہیٰ

یعنی چونکہ مذکور بالا زبردستی خلیفہ بن جانے والے (یزید) نے پہلے اہل مدینہ سے بیعت خدا و رسولؐ کی طرح اپنی بیعت لی تھی جیسا کہ جامع الاصول میں ہے اور اس کے زبردستی خلیفہ بننے کی بنیاد اس کے باپ ہی کے وقت سے مستحکم کی جارہی تھی اور خود معاویہ کو اس بات میں شدید اہتمام رہتا تھا کہ بزرگان اسلام سے کسی طرح یزید کی بیعت حاصل کرلیں یہاں تک کہ اس کے ''۱۰'' و انصار کسی شخص پر ذرہ برابر بھی اس کا شبہ ہوجاتا تھا کہ یہ بیعت یزید کی

مخالفت کرے گا تو فوراً بڑوں بڑوں کا خون بہا ڈالتے تھے اور اس کا یہ طریقہ اس کی قوم میں برابر جاری اور قائم رہا یہاں تک کہ حضرت ابن عمر بھی دوسرے بزرگان دین کی طرح حجاج کے اشارہ پر ایک ظالم کے ہاتھ سے جس نے زہر آلود نیزا ان کے پاؤں میں دیا تھا شربت شہادت پی کر دنیا سے انتقال کر گئے۔
جیسا کہ علامہ ابن عبدالبر کی کتاب استعیاب (جلد ا ص ۳۸۱) میں ہے۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن عمر نے مجبوراً یزید کی بیعت کر لی اور ظالموں کے کشمکش سے الگ ہو گئے اور شیعوں کے مذاق کے مطابق بھی ان حضرات نے جو حق پر تھے اپنے زمانہ کی مصیبتوں سے مجبور ہو کر ایسے لوگوں کی بیعت کی ہے جو باطل پر تھے۔ چنانچہ شریف مرتضی نے کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں حضرت امام حسن علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ رہا مسئلہ حضرتؑ کی بیعت کا پس اگر اس سے یہ مراد ہے کہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور رضا ظاہر کی اور اس سے جنگ موقوف کر دی تو ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے واقع ہونے کی مجبوریوں اور دقتوں کو ہم بیان کر چکے ہیں اور ان اسباب کو بھی بتا چکے ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ اور ایسا کرنے سے حضرت پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ایسا کرنے سے حضرتؑ کے پدر بزرگوار پر بھی اعتراض نہیں ہوسکتا جب کہ حضرتؑ نے اپنے متقدمین کی بیعت کر لی تھی اور ان لوگوں سے لڑے نہیں تھے۔
غرض چونکہ یزید کی بیعت چھوڑنے سے خون ریزی ہونا لازمی امر تھا اس وجہ سے جناب عبداللہ بن عمر نے مدینہ والوں کے خلع بیعت کے وقت اپنے خدم و حشم کو جمع کر کے انہیں فتنہ و فساد اور جنگ و خون ریزی سے روکا اور عبداللہ بن مطیع کو بھی بیعت چھوڑنے سے منع کر دیا تھا۔ اور علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ غالباً معاویہ کی رائے خلافت کے بارے میں یہ تھی کہ جو شخص قوۃ،

فہم وتدبر اور عقل وسیاست میں بہتر ہو اس کو ایسے شخص پر ترجیح دی جائے جو اسلام کی سبقت اور مذہبی خوبیوں میں افضل ہو لہذا انہوں نے اس کو طے کرلیا کہ وہی خلافت کے زیادہ مستحق ہیں مگر حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے اس کے خلاف تھی اور وہ یہ کہتے تھے کہ جب فتنہ وفساد کا ڈر نہ ہو اس وقت تک مفضول کی بیعۃ نہیں کرنے چاہیے اور دوسری جگہ اس عبارت کے بعد لکھا ہے کہ اسی (فتنہ وفساد کے خوف کی) وجہ سے انہوں نے (عبداللہ بن عمر) بیعت کرلی اور اس کے بعد یزید کی بیعت بھی کی اور اپنے خاندان والوں کو یزید کی بیعت توڑنے سے منع کیا جیسا کہ انشاء اللہ فتنوں کے بیان میں تفصیل سے لکھا جائیگا۔ (قسطلانی جلد ۶ ص ۲۶۳)

چودہویں دلیل۔ صحیح بخاری میں ہے: عن ابن عمر قال دخلت علے حفصة و نسواتها تنطف قلت قد کان من امر الناس ماترین فلم یجعل لی من الامر شئی۔ فقالت الحق بهم فانهم ینتظرونك واخشی ان یکون فی احتباسك منهم فرقة فلم تدعه حتی ذهب۔ فلما تفرق الناس خطب معویة قال من کان یرید ان یتکلم فی هذا الامر فیطلع لنا قرنه فنحن احق به منه ومن ابیه ۔ قال حبیب ابن مسلمة فهلا اجبته قال عبدالله فحللت حبوتی و هممت ان اقول احق بهذا الامر منك من قاتلك واباك علی الاسلام فخشیت ان اقول کلمة تفرق بین الجمع وتسفك الدم و تحمل علے غیر ذلك فذکرت ما اعدالله فی الجنان قال حبیب حفظت وعصمت یعنی جناب عبداللہ بن عمر بیان کرتے تھے کہ میں حضرت حفصہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت ان کی زلفوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے میں نے عرض کی بہن مسلمانوں کی حکومت اور خلافت کا

مسئلہ جس طرح طے ہوا اس کو آپ نے دیکھ لیا کہ مجھے اس سے کوئی حصہ بھی نہیں دیا گیا۔ حفصہ نے کہا تم بھی انہیں سے مل جاؤ کہ یہ سب تمہارے انتظار میں ہیں اور میں ڈرتی ہوں کہ اگر تم ان سے الگ رہے تو کوئی فتنہ اور اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ غرض جناب حفصہ نے اپنے بھائی عبداللہ کو کسی طرح نہیں چھوڑا اور ان کو برابر یہی سمجھاتی رہیں یہاں تک کہ وہ معاویہ کے پاس چلے گئے۔ وہاں سے جب لوگ متفرق ہو گئے تو معاویہ نے خطبہ دیا جس میں کہا کہ جو شخص اس خلافت کے بارے میں کوئی دعویٰ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اپنا سر اونچا کر دے مگر یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس شخص سے اور اس کے باپ سے بھی زیادہ اس خلافت کا حق ہے (معاویہ کا اشارہ انہیں عبداللہ بن عمر کی طرف تھا کہ اگر ان کو خلافت کا دعویٰ ہے تو اپنا سر اونچا کر دیں مگر یہ جان لیں کہ ان سے اور ان کے باپ عمر بن الخطاب سے زیادہ ہم کو اس خلافت کا حق ہے) حبیب بن مسلمہ نے جناب عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ پھر آپ نے معاویہ کو اس کا جواب کیوں نہیں دیا؟ جناب عبداللہ نے کہا ہاں میں نے بھی اپنی کمر کھول لی تھی اور چاہتا تھا کہ کہوں اس خلافت کا حق تجھ سے زیادہ اس شخص کو ہے جس نے اسلام پر تجھ سے بھی جہاد کیا۔ اور تیرے باپ (ابوسفیان) سے بھی جنگ کی (ابن عمر کا اشارہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی طرف تھا جنہوں نے حضرت رسول خداؐ کے زمانہ میں اسلام کی طرف سے ابوسفیان کے ساتھ بھی جہاد کیا تھا اور معاویہ کے ساتھ بھی) مگر میں ایسا کلمہ کہنے سے ڈرا جو لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا کر دے جس سے خون ریزی ہونے لگے اور میرا جو مقصود تھا اس کے سوا اس کا مطلب لیا جائے۔ لہٰذا میں نے اس ثواب کو یاد کیا جو خدا نے بہشت میں (صبر کرنے والوں کے لئے) مہیا کر رکھا ہے۔ حبیب نے آپ سے کہا آپ بچ

گئے اور محفوظ رہے۔ (صحیح بخاری پارہ ۱۶ ص ۶۳)

پندرہویں دلیل۔ جناب ملا متقی نے لکھا ہے: عن نافع ان رجلا سال ابن عمر عن متعۃ النساء فقال ھی حرام۔ فقال لہ ابن عباس یفتی بھا فقال ابن عمر الا ترمرم بھا ابن عباس فی زمن عمر یواخذ فیھا احد الرجمہ انتھیٰ۔ یعنی ایک شخص نے جناب عبداللہ بن عمر سے متعہ کو دریافت کیا۔ انہوں نے کہا حرام ہے۔ اس شخص نے کہا کہ جناب ابن عباس تو اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا کرتے ہیں۔ ابن عمر نے کہا مگر ابن عباس حضرت عمر کے زمانے میں کیوں نہیں بولتے تھے اور ان کے سامنے اس کو جائز کیوں نہیں کہتے تھے؟ اگر اس وقت کوئی اس بات کی جرأت کرتا تو حضرت عمر اس کو سنگسار ہی کر دیتے (کنز العمال جلد ۸ ص ۲۹۴) اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عمر کے ڈر سے ان کے زمانہ میں تقیہ کرتے تھے اور متعہ کے بارے میں اپنا مذہب ظاہر نہیں کرتے تھے۔

سولہویں دلیل۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: اول من زخرف المساجد الولید بن عبد الملک بن مروان و ذلک فی اواخر عھد الصحابۃ وسکت کثیر من احل العلم عن انکار ذلک خوفا من الفتنہ یعنی سب سے پہلے جس شخص نے مسجدوں کو نقش و نگار سے زینت دی اور سونا چڑھا کر آراستہ کیا خاندان بنی امیہ کا خلیفہ ولید بن عبدالملک تھا اس نے یہ کام صحابہ کے آخری زمانہ میں کیا مگر فتنہ کے ڈر سے اکثر اہل علم اس بدعت پر خاموش رہے اور اس پر اعتراض نہیں کر سکے نہ اس کو منع کر سکے (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۱۰ باب من بناء المسجد) اور سب جانتے ہیں کہ نہی عن المنکر واجب ہے۔ پس اس وقت کے اہل علم نے جو فتنہ کے خوف سے اپنی اس واجبی

عبادت کو ترک کیا یہ در حقیقت تقیہ ہی تو ہے۔

سترہویں دلیل۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضرت عمر کے سامنے حضرت عمار نے وہ حدیث بیان کی جس میں یہ حکم ہے کہ جس شخص کو پانی نہ ملے اس پر واجب ہے کہ تیمم کرلے تو حضرت عمر نے کہا: اتق اللہ یا عمار اے عمارؓ اللہ سے ڈرو۔ اس پر حضرت عمارؓ نے کہا: ان شئت لم احدث بہ یعنی اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں اس حدیث کو نہیں بیان کروں گا (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۶۱) حضرت عمارؓ کا مطلب صاف ہے کہ اے عمر اگر آپ نہیں چاہتے اور حق کہنے پر اذیت پہنچائیں گے تو میں اس حدیث کو بیان نہیں کروں گا یعنی تقیہ کرلوں گا۔ کیونکہ صرف حضرت عمر کی خوشی کے لئے ایسی حدیث کو روکنا جس کا تعلق مذہب اور خدا کی عبادت سے ہے اور خلق کو گمراہ رکھنا بے معنی بات ہے (البتہ چونکہ حضرت عمار حضرت عمرؓ کی ایذاء سے ڈرے اس وجہ سے تقیہ کرنے پر مجبور ہوئے اور وعدہ کیا کہ اب اس حدیث کو نہیں بیان کریں گے)۔

اٹھارہویں دلیل۔ فقہ کی کتاب فرائض شریفی میں ہے: اول من حکم بالعول عمر فانہ وقع فی عھدہ صورۃ ضاق مخرجھا عن فروضھا۔ فشاور الصحابۃ فیھا فاشار العباس الی العول۔ فقال اعیلوا الفرائض فتابعوہ علی ذلک ولم ینکرہ احد الا ابنہ بعد موتہ۔ فقیل لہ ھلا انکرتہ فی زمن عمر فقال ھبتہ و کان مھیبا۔ الی ان قال ھلا یجتمعون حتی نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین ان الذی احصیٰ رمل عالج عدد الم یجعل فی مال نصفین و ثلثا انتھی یعنی سب سے پہلے جس شخص نے میراث میں عول کرنے کا حکم دیا وہ حضرت عمر ہیں۔ ان کی خلافت میں ایک ایسی صورت پیش آئی جس میں اس کے فروض سے نکلنے کی راہ

کے موافق کہتے تھے ان کے بارے میں انہوں نے صاف کہہ دیا کہ: فنجعل لعنة الله علے الکاذبین یعنی ہم لوگ خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹوں پر لعنت نازل کرے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب شریعت خدا اور رسولؐ کے خلاف کرنے والوں پر اس وقت حضرت ابن عباس تک لعنت کرتے تھے تو پھر اس زمانہ میں جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان پر کیونکر اعتراض ہوسکتا ہے۔

اور کتاب التحقیق شرح مختصر ابو محمد الاخسکی میں اس بیان کے متعلق کہ سکوت کرنے سے اجماع نہیں ثابت ہوتا لکھا ہے: ودائود الظاهری و بعض المعتزلة تمسکوا فی ذلك بأن السکوت قد یکون للمهابة والتقیة کما قیل لابن عباس لما اظهر قوله فی العول وقد کان ینکره هلا قلت هذا فی زمن عمر وانه کان یقول به فقال کان رجلا مهیبا فهبته وفی روایة منعنی من ذلك درته انتهی۔

یعنی داؤد ظاہری اور بعض معتزلہ نے اس باب میں کہ سکوت سے اجماع نہیں ثابت ہوسکتا یہ دلیل پیش کی ہے کہ سکوت تو کبھی دوسروں کے خوف سے اور تقیہ سے بھی ہوتا ہے (یعنی کسی مسئلہ کے متعلق صحابہ یا علماء و مجتہدین اس وجہ سے بھی سکوت کرتے ہیں کہ اگر اس کی حقیقت ظاہر کردیں گے تو بادشاہ وقت کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ ہم پر ظلم کرے گا لہٰذا وہ تقیہ کرلیتے ہیں) جیسا جناب ابن عباس کا واقعہ ہوا کہ جب انہوں نے عول کو شریعت اسلام کے خلاف ظاہر کیا اور اس پر اعتراض کیا تو لوگوں نے ان سے کہا آپ نے اپنی یہ رائے حضرت عمر کے زمانہ میں کیوں نہیں ظاہر کی تھی جو اس کا حکم دیتے اور اس کو پھیلاتے رہتے تھے۔ جناب ابن عباس نے کہا کہ وہ (حضرت عمر) مہیب شخص تھے تو میں ان سے ڈرتا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جناب ابن

عباس نے کہا میں تو ان کے دُرّے سے ڈرتا تھا (پھر ان کے سامنے اس کی جرات کیونکر کرتا کہ عول کو ناجائز اور خلاف شریعت اسلام کہوں) اس عبارت سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ حضرت ابن عباسؓ تقیہ کرتے تھے۔

انیسویں دلیل۔ کتاب تہذیب الکمال خطی میں لکھا ہے: قال الاعمش عن عبدالمالك میسرہ عن النزال بن سرہ قال کنا مع حذیفة فقال له عثمان یا ابا عبدالله ما هذا الذی یبلغنی عنك۔ قال ما قلته۔ قال عثمان ان صدقهم و ابرهم فلما خرج قلت یا ابا عبدالله الم تقل ما قلته قال بلی، ولکنی اشتری دینی ببعضه مخالفته ان یذهب کله۔ یعنی نزال کہتے تھے کہ میں حذیفہ کے ساتھ تھا تو سنا کہ ان (حذیفہ) سے حضرت عثمان نے کہا کہ اے ابوعبداللہ (حذیفہ کی کنیت) تمہارے بارے میں یہ کیا کیا میں سنتا رہتا ہوں۔ حذیفہ نے جواب دیا کہ آپ نے جو سنا ہے وہ میں نے کہا ہی نہیں ہے۔ حضرت عثمان نے کہا تو ان سب لوگوں سے زیادہ سچے اور پرہیزگار تم ہی ہو (یعنی جن لوگوں نے تمہارے بارے میں وہ خبریں مجھ تک پہنچائیں وہ سب جھوٹے ہیں اور تم جو انکار کرتے ہو سچے ہو بے شک تم نے نہیں کہا ہے) جب حذیفہ وہاں سے باہر نکلے تو میں (نزال) نے ان سے کہا اے ابوعبداللہ (حذیفہ) کیا تم نے حضرت عثمان کے بارے میں وہ باتیں نہیں کہی تھیں؟ حذیفہ نے کہا کہی کیوں نہیں تھیں۔ ضرور کہی ہیں مگر (اس وقت اس وجہ سے انکار کردیا کہ حضرت عثمان سے ڈرتا ہوں اقرار کرلیتا تو وہ ظلم کرتے اور میرا معمول یہ ہے کہ اپنا تھوڑا ایمان بیچ کر باقی ایمان کو بچالیتا ہوں اس خوف سے کہ پورا ایمان نہ جاتا رہے (تہذیب الکمال ص) اس عبارت سے صاف صاف معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہ اتنے بڑے صحابی نے حضرت عثمان کے ڈر سے تقیہ کیا اور جس بات کو یقیناً کہہ چکے

تھے حضرت عثمان کے پوچھنے پر اس سے صاف انکار کر دیا۔

بیسویں دلیل: جناب شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے لکھا ہے: ابو یوسف اخبرنی محمد بن اسحاق عن ابی جعفر قلت له ما کان رای علی فی الخمس قال کان رایه فیه رای اهلبیته ولکن کره ان یخالف ابا بکر و عمر۔ یعنی محمد بن اسحاق کہتے تھے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ خمس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کی رائے کیا تھی (یعنی خمس سے ذوی القربیٰ کا حصہ دیتے تھے یا نہیں) حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ جناب امیرؑ کی رائے وہی تھی جو اہلبیتؑ کی رائے تھی (یعنی ذوی القربیٰ کا حصہ بھی خمس سے دیا جائے) مگر حضرت اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ ظاہر بظاہر حضرت ابوبکر و عمر کی مخالفت کریں اسی سبب سے ذوی القربیٰ کا حصہ حضرتؑ بھی نہیں دیتے تھے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جناب امیر المومنینؑ کے نزدیک ذوی القربیٰ کا حصہ دینا واجب تھا مگر چونکہ حضرت ابوبکر و عمر نے حضرت رسول خداؐ کے خلاف ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا اس وجہ سے جناب امیر بھی اول و دوم کی موافقت میں تقیہ کرتے اور ذوی القربیٰ کا حصہ نہیں دیتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر دیں گے اور اول و دوم صاحب کے پیروان کو معلوم ہو جائیگا کہ حضرت ان دونوں کے خلاف کام کر رہے ہیں تو فتنہ و فساد برپا کر دیں گے۔ ۱؎

اکیسویں دلیل۔ صحیح مسلم میں ہے: عن مطرف قال بعث الیّٰ

۱؎ علامہ ملا علی قاری نے مذکورہ بالا روایت کو اس طرح لکھا ہے روی الطحاوی عن محمد بن خزیمه عن یوسف بن عدی عن عبد الله بن مبارک عن محمد بن اسحاق قالت سالت ابا جعفر یعنی محمد بن علی فقلت المدینت علی ابن ابیطالب حیث ولی العراق و دعی من ولی من امر الناس کیف صنع فی سهم ذوی القربی قال ملك ابی والله سبیل ابی بکر و عمر فقلت و کیف انتم تقولون ما تقولون قال اما والله ما کان اهله یصدرون عن رایه فقلت فما منعه قال کره والله ان یدعی علیه بخلاف سیرة ابی بکر و عمر یعنی محمد بن اسحاق نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا (باقی صفحہ ۸۶ پر ملاحظہ ہو)

عمران بن حصین فی مرضه الذی توفی فیه فقال ان کنت محدثک باحادیث لعل الله ان ینفعك بها بعدی فان عشت فاکتم عنی وان مت فحدث بها ان شئت انه سلّم علیّ واعلم ان نبی الله قد جمع بین حج وعمرة ثم لم ینزل فیها کتاب ولم ینه عنها نبی الله قال رجل برائه فیها ما یشاء یعنی مطرف نے کہا مجھے پیغام بھیج کر عمران بن حصین نے بلا بھیجا اس بیماری میں جس میں انکی وفات ہوئی تھی اور کہا کہ میں تم سے کئی حدیثیں بیان کرتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ میرے بعد تم کو ان سے نفع دیوے پھر اگر میں بچ گیا تو تم ان حدیثوں کو چھپائے رکھنا۔ اور اگر میں مر گیا تو چاہو بیان کر سکتے ہو۔ ایک بات یہ ہے کہ مجھ پر سلام کیا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ خوب یقین رکھو کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج اور عمرہ دونوں کو (ایام حج میں) جمع کیا اور پھر اس کے متعلق نہ قرآن اترا نہ آنحضرتؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور اس شخص (حضرت عمر) نے جو چاہا اپنی رائے سے کہہ دیا (صحیح مسلم کتاب الحج باب التمتع المعلم جلد ۳ ص ۲۷۲) اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت عمر نے آنحضرتؐ کے خلاف حج وعمرہ کو جمع کرنے سے منع کر دیا تو عمران بن حصین نے ان کے اس حکم کو دل سے نہیں مانا مگر ان کے خوف سے تقیہ کیا اور زبان سے یہ نہ کہہ سکے کہ اے خلیفہ آپ نے اس کو منع کیوں کیا خود حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج وعمرہ کو جمع کیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۸۶)

کہ جب حضرت امیر المومنین علیہ السلام عراق کے حاکم ہوئے تو ذوی القربیٰ کے حصہ کے بارے میں حضرت نے کیا کیا۔ جناب امام محمد باقرؑ نے فرمایا کرتے کیا جو حضرت ابوبکر وعمر کرتے تھے وہی حضرتؑ کو بھی کرنا پڑا میں نے کہا پھر آپ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ذوی القربیٰ کو بھی حصہ دینا چاہیے وہ کیا ہوا؟ حضرتؑ نے فرمایا خدا کی قسم حضرتؑ کی رائے سے ان کے اہل بیت علیحدہ نہیں ہیں۔ حضرتؑ کی رائے یہی تھی کہ ذوی القربیٰ کو حصہ دینا چاہیے۔ میں نے کہا پھر حضرتؑ نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ حضرتؑ نے فرمایا خدا کی قسم حضرتؑ نے اس کو ناپسند کیا کہ لوگ کہیں دیکھو یہ ابوبکر وعمر کے خلاف کر رہے ہیں (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

بائیسویں دلیل۔ علامہ کرمانی نے لکھا ہے: قال الامام سراج اهل البیت زین العابدین علی بن الحسین علی رضی الله عنهم

رب جوهر علم لوابوح به لقیل لی انت ممن لعبد الوثنا

ولا ستحل رجال مسلمون دمی۔ یرون اقبح ما یاتونه حسنا

یعنی خاندان اہل بیت کے سراج منیر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے دماغ میں بڑے بڑے جواہر علم بھرے ہیں جن کو اگر میں ظاہر کرنے لگوں تو میرے بارے میں کہا کہ آپ ان لوگوں میں ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں اور مسلمان میرا خون بہانا حلال سمجھ لیں اور جس بدترین کام کو وہ کرتے ہیں اسے اچھا سمجھ لیں۔ (شرح صحیح بخاری) اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام زین العابدینؑ لوگوں کے ڈر سے بکثرت جواہر علوم کو مخفی رکھتے تھے اور اس خوف سے کہ اگر ظاہر کروں گا تو لوگ میرا خون بہادیں گے ان علوم کو بیان نہیں کر سکتے تھے اور یہی تقیہ ہے۔

تیئسویں دلیل۔ مشکوٰۃ میں ہے: عن ابن عمر قال صلی رسول الله بمنی رکعتین و ابوبکر بعده و عمر بعد ابی بکر و عثمان صدر امن خلافته ثم ان عثمان صلے بعد اربعا فکان ابی بکر و عمر اذا صلی مع الامام صلے اربعا و اذا صلّها وحده لا صلے رکعتین متفق علیه یعنی جناب عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ میں دو رکعتیں نماز پڑھیں آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکر پھر ان کے بعد حضرت عمر پھر ان کے بعد اپنی خلافت کے شروع میں حضرت عثمان نے بھی دو ہی رکعتیں پڑھیں۔ مگر کچھ دنوں کے بعد حضرت عثمان نماز چار رکعتیں پڑھنے لگے یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وغیرہ منیٰ میں نماز قصر کیا کرتے تھے مگر حضرت

عثمان منیٰ میں بجائے قصر کے پوری نماز پڑھنے لگے۔ پس جناب عبداللہ بن عمر جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے تو چار رکعتیں پڑھتے اور جب تنہا پڑھتے تو دو ہی رکعتیں پڑھتے یہ حدیث صحیح بخاری جلد ا ص ۱۴۷ باب صلاۃ و صحیح مسلم و مشکوٰۃ میں بھی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب عبداللہ بن عمر حضرت عثمان اور ان کے طرفداروں سے تقیہ کر کے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھتے تھے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے موافق دو رکعت پڑھنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب اکیلے ہوتے اور حضرت عثمان کا خوف نہ ہوتا تو دو رکعت ہی پڑھتے تھے۔

چوبیسویں دلیل۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے لکھا ہے:

صلی ابن مسعود بمنیٰ مع عثمان اربعا فقیل له اتحدثنا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلے رکعتین و ابابکر و عمر فقال بلی ولکن عثمان امام او اخالفه والخلاف شر یعنی ابن مسعود صحابی نے منیٰ میں حضرت عثمان کے ساتھ نماز کو (قصر نہیں کیا بلکہ پوری) چار رکعتیں پڑھیں۔ اس پر ان کو لوگوں نے ٹوکا کہ تم یہ بیان کرتے ہو کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر و عمر نے دو رکعتیں ہی پڑھی تھیں (پھر تم نے حضرت عثمان کے ساتھ چار رکعتیں کس شریعت کے مطابق پڑھ لی ہیں) ابن مسعود نے کہا ہاں میں یہ حدیث بیان کرتا ہوں (کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں) لیکن حضرت عثمان اس وقت ہمارے بادشاہ ہیں پھر کیا میں ان کے خلاف کروں؟ حالانکہ ان کے خلاف کرنے میں شر اور نقصان ہے (ازالۃ الخفاء مقصد ص) اس سے بھی ثابت ہوا کہ ابن مسعود صحابی نے حضرت عثمان کے ڈر اور فتنہ و فساد کے خوف سے دو رکعت کی جگہ چار رکعت نماز پڑھ لی (جو خلاف شریعت تھی) پس

ان کا یہ فعل بھی تقیہ ہی تو ہے۔

پچیسویں دلیل: امام نواوی نے شرح صحیح مسلم میں امام مسلم کے قول: الا ان آل ابی فلان لیسوا الی باولیاء (مگر یہ کہ ابوفلاں کی اولاد میری اولیاء نہیں ہیں) کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: وهذه الكناية بقوله يعنى فلانا من بعض المرواة خشى ان يسميه فيترتب عليه مفسدة او فتنة اما فى حق نفسه واما فى حق غيره فكنى عنه انتهى۔ یعنی اس روایت میں جو ابو فلاں ہے تو یہ فلاں کا لفظ راوی نے اپنی طرف سے لکھا ہے کیونکہ اس کو خوف ہوا کہ اگر وہ نام جو اس حدیث میں صاف صاف ہے اور جس کو تصریح سے حضرت رسول خدا نے لیا تھا یہ راوی بھی ذکر کردیتا ہے تو اس سے اس کو نقصان پہنچے گا یا کسی اور کے لئے مضر ہوگا۔ اس سبب سے اس راوی نے اس نام ہی کو روایت سے اُڑا دیا اور اس کی جگہ فلاں کہہ دیا۔ (شرح صحیح مسلم جلد ص) اس سے بھی واضح ہوا کہ حضرت رسولِ خدا نے جن لوگوں کے بارے میں کوئی حدیث اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی تھی اگر بعد کے راوی اس نام کے لینے میں کسی نقصان یا فتنہ وفساد کا خوف کرتے تو اس کی جگہ فلاں کہہ دیتے اور یہی تقیہ ہے۔

چھبیسویں دلیل۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے: ابراهيم النخعى كان يتكلم عند وقت الخطبه فقيل له فى ذلك فقال انى صليت الظهر فى دارى ثم رحت الى المسجد تقية۔ یعنی جناب ابراہیم نخعی خطبہ کے وقت بات چیت کرتے تھے اس بارے میں ان سے گفتگو کی گئی (کہ ایسا کیوں کرتے ہیں) تو وہ کہتے تھے کہ میں ظہر کی نماز اپنے گھر میں پڑھ چکا ہوں پھر تقیہ کرکے مسجد میں آیا ہوں (یعنی مسجد میں ان لوگوں کے ساتھ نماز جماعت

پڑھنی مجھے مقصود نہیں مگر ان لوگوں سے ڈرتا ہوں کہ ان کی نماز جماعت میں نہیں شریک ہوں گا تو یہ نقصان پہنچائیں گے اس وجہ سے تقیہ کرتا اور مسجد میں چلا آتا ہوں۔

ستائیسویں دلیل۔ علامہ ابن خلکان نے لکھا ہے: لما ولی عمر بن بصیرۃ الفراری العراقین و اضیفت الیہ خراسان ایام یزید بن عبدالملک استدعی الحسن بن ابی الحسن البصری و عامر بن شرحیل الشعبی و محمد بن سیرین و ذلک فی سنۃ ثلاث و مائۃ فقال لھم ان یزید بن عبدالملک خلیفۃ اللہ استخلفہ علی عبادہ و اخذ میثاقھم بطاعتہ واخذ عھدنا بالسمع والطاعۃ وقد ولّانی ما ترون فکتب الیّ بامرمن امورہ فاقلدہ ما تقلدہ من ذلک الامر فقال ابن سیرین والشعبی قولا فیہ تقیۃ

یعنی خلیفہ یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں جب عمر بن ھبیرہ فزازی عراق عرب و عراق عجم کا حاکم بنایا گیا اور خراسان کا صوبہ بھی اسی کے ماتحت کر دیا گیا تو اس نے حسن بن ابوالحسن بصری۔ عامر بن شرحیل شعبی اور محمد بن سیرین کو اپنے ہاں بلا بھیجا اور یہ ۱۰۳ھ کا واقعہ ہے۔ پس ان سب لوگوں سے عمر بن ھبیرہ نے کہا کہ یزید بن عبدالملک اللہ کا خلیفہ ہے جس کو اس نے اپنے بندوں پر مقرر کیا ہے اور اس کی اطاعت کا عہد و پیمان ان سے لیا ہے اور ہم لوگوں سے اس کی فرمان برداری کا وعدہ لیا ہے اور اس نے مجھے جس حکومت پر مقرر کیا ہے اس کو آپ دیکھتے ہیں۔ اب اس نے مجھے ایک خاص بات کے لئے لکھا ہے۔ پس اس نے اس بات کو جس طرح میرے متعلق کیا ہے اسی طرح میں اسے انجام دوں گا۔ اس پر ابن سیرین اور شعبی نے ایسی بات کہی جس میں تقیہ تھا۔ یعنی ایسی

بات کہی اس سے عمر بن ھبیرہ کی موافقت ہوگئی اگرچہ اس کو واقعاً یہ لوگ حق نہیں سمجھتے تھے (تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۱۲۹) اور یہ علامہ شعبی و محمد بن سیرین حضرات اہل سنت کے اعاظم و اکابر بلکہ پیشوایان دین سے تھے۔ پس ان لوگوں نے تقیہ کیا اگر یہ جائز کام نہیں تھا تو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے تقیہ کر کے گناہ کیا جس سے ان کا فاسق ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ کوئی مسلمان اس کا دعوی نہیں کرسکتا۔ لہذا تقیہ کا جائز ہونا ماننا پڑے گا۔

اٹھائیسویں دلیل۔ امام غزالی صاحب نے لکھا ہے: یروی عن ابن عائشہ ان الحجاج دعا بفقهاء البصرة وفقهاء الكوفة قال دخلنا عليه ودخل الحسن البصري ﷺ آخر من دخل فقال الحجاج مرحبا بابی سعید الیّ الیّ ثم دعا بكرسی فوضع الی جنب سریر فقعد علیه فجعل الحجاج يذاكرنا و يسالنا اذ ذكر علی ابن ابيطالب فنال منه و نلنا منه مقاربة له و فرقا من شره انتهی یعنی ابن عائشہ بیان کرتے ہیں کہ حجاج (مشہور حاکم بنی امیہ) نے بصرہ اور کوفہ کے پیشوایان دین کو بلا بھیجا جب ہم سب لوگ وہاں پہنچے اور سب کے آخر میں جناب حسن بصری رحمہ اللہ بھی پہنچے تو حجاج نے کہا واہ واہ جناب ابوسعید (حسن بصری) بھی تشریف لائے۔ آپ ادھر تشریف لائیں آپ میرے پاس تشریف رکھیں۔ پھر اس نے ایک کرسی منگالی اور اپنے تخت کے بغل میں بچھوا کر انکو اسپر بٹھایا۔ پھر حجاج ہم لوگوں سے علمی مذاکرہ اور سوال وغیرہ کرنے لگا۔ اتنے میں حضرت علی ابن ابیطالبؑ کا ذکر آ گیا تو اس نے حضرت کو برا کہا۔ ہم لوگوں نے بھی اس کی خوشامد میں اور اس کے ظلم کے ڈر سے حضرت کو برا کہا (احیاء العلوم جلد ۲ ص ۳۴۶ باب الامراء السلاطین) اس سے معلوم ہوا کہ بصرہ اور کوفہ کے علماء اور پیشوایان مذہب

نے جن میں جناب ابن عائشہ بھی تھے حجاج کی خوشامد میں اور اس کے ظلم کے ڈر سے معاذ اللہ حضرت امیر المومنین کو برا کہا اور یہی تقیہ ہے۔

انتیسویں دلیل۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے: و کتب المامون الیه (اے نائبه) ایضاً فی اشخاص سبعة انفس وهم محمد بن سعید کاتب الواقدی۔ و یحیی بن معین و ابو خیثمه و ابومسلم و اسمعیل بن دائود و اسمعیل بن ابی مسعود و احمد بن ابراهیم الدورقی فاشخصوا الیه فامتحنهم بخلق القرآن فاجابوه تقیة یعنی خلیفہ مامون نے اپنے نائب کو لکھا کہ سات بڑے علماء کو جو (۱) محمد بن سعید واقدی (۲) یحییٰ بن معین (۳) ابوخیثمہ (۴) ابومسلم (۵) اسمٰعیل بن داوٗد (۶) اسمٰعیل بن ابو مسعود اور (۷) احمد بن ابراہیم دورقی تھے میرے ہاں روانہ کردو۔ چنانچہ یہ کل حضرات مامون کے پاس بھیج دیئے گئے۔ اس نے ان سب لوگوں کا امتحان لیا کہ بتایئے خلق قرآن کے مسئلہ میں آپ کا کیا اعتقاد ہے۔ ان سب بڑے جلیل القدر علماء نے تقیہ کرکے اس کے موافق بات کہہ دی (تاریخ الخلفاء ص ۲۱۱) اور علامہ یافعی نے ۲۱۸ھ کے واقعات میں لکھا ہے: وفیها امتحن المامون العلماء بخلق القران و کتب الی نائبه علی بغداد و بالغ فی ذلك وقام فی هذه البدعة قیام متعبدبها فاجاب اکثر العلماء علی سبیل الاکراه و توقف طائفة ثم اجابوا۔ یعنی اسی سال مامون نے بڑے بڑے علماء اہل سنت کا امتحان خلق قرآن کے مسئلہ میں کیا اور بغداد میں اپنے نائب کو لکھا اور اس میں بڑا مبالغہ کیا اور اس بدعة کے قائم کرنے میں اس طرح زور دیا کہ معلوم ہوتا تھا اس نے اس کو مستقل مذہب اسلام سمجھ لیا ہے اس کے امتحان پر اکثر علماء نے مجبوراً اس کے موافق اپنا اعتقاد

ظاہر کر دیا اور بعض علماء رکے رہے مگر پھر انہوں نے بھی اسی کے موافق اپنا اعتقاد بیان کر دیا (مرآۃ الجنان جلد ۲ ص ۷۷) [۱]

تیسویں دلیل - صحیح بخاری میں ہے: قال الحسن التقیۃ الی یوم القیامۃ ۔ یعنی امام حسن بصری جو حضرات اہل سنت کے اعاظم و اکابر علماء و پیشوایان دین میں ہیں لکھتے ہیں کہ تقیہ کرنا قیامت تک کے لئے جائز کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری پارہ ۲۸ ص ۴۵۱) اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: قال حمید و ابن ابی شیبہ من روایۃ عوف الاعرابی عن الحسن البصری ، قال التقیۃ جائزۃ للمومنین الی یوم القیامۃ الا انہ کان لا یجعل فی القتل تقیۃ و لفظ عبد بن حمید لا فی النفس التی حرم اللہ قلت معنی التقیۃ الحذر من اظہار ما فی النفس من معتقل و غیرہ للغیر ۔ یعنی امام حسن بصری فرماتے تھے کہ ہر مسلمان کے لئے قیامت تک تقیہ کرنا جائز ہے مگر یہ کہ وہ قتل کے معاملہ میں تقیہ کو جائز نہیں کہتے تھے (مثلاً کوئی ظالم بادشاہ کسی سے کہے کہ تم میرے مذہب کو اختیار کر لو ورنہ میں تم کو سزا دوں گا یا تم پر

---

[۱] چودھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اندر حضرات اہل سنت کے جو بڑے علامہ اور مورخ گذرے ہیں یعنی شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب انہوں نے بھی اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے "قرآن کے حادث ہونے کا مسئلہ اس رسوخ کے ساتھ اس (مامون) کے دل میں بیٹھ گیا کہ اس کے نزدیک اس مسئلہ سے انکار کرنا گویا اصل توحید سے انکار کرنا تھا۔ ۲۱۸ھ میں جب وہ شام کے اضلاع میں مقیم تھا تو اسحق خزاعی گورنر بغداد کو ایک فرمان بھیجا جس کا مختصراً مضمون یہ تھا امیر المومنین کو معلوم ہوا کہ عموماً تمام مسلمان جو شریعت کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے قرآن کے قدم کے قائل ہیں۔ حالانکہ خود قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ یہ لوگ بدترین امم اور ابلیس کی زبان ہیں۔ بغداد کے تمام قاضیوں کو جمع کر کے یہ فرمان سنا دیا جائے اور جس کو انکار ہو وہ ساقط العدالت مشہور کر دیا جائے۔ مامون کو اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی اور سات بڑے بڑے عالموں کو جو مذہبا بہت بڑا اقتدار رکھتے تھے اپنے پاس طلب کیا اور رُو در رُو گفتگو کی۔ یہ سب لوگ اس مسئلہ میں مامون کے خلاف تھے مگر تلوار کے ڈر سے وہ کہہ آئے جو ان کا دل نہیں کہتا تھا۔ جب یہ لوگ بھی مامون کے ہم زبان بن گئے تو اس نے اسحاق کے نام ایک دوسرا فرمان بھیجا کہ ممالک اسلامیہ کے تمام علماء اور مذہبی پیشواؤں کا اظہار لیا جائے۔ اس حکم کی پوری پوری تعمیل ہوئی اور سب کے اظہار ان کے خاص الفاظ میں (باقی صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ ہو)

ظلم کروں گا۔تو تقیہ کر کے اس کا مذہب اختیار کر لینا جائز ہے۔لیکن اگر وہی ظالم بادشاہ کہے کہ تم فلاں شخص کو قتل کر دو ورنہ میں تمہاری سزا کروں گا تو تقیہ کر کے اس شخص کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور عبد بن حمید کی روایت میں ہے کہ سوا اس نفس کے جس کے قتل کو خدا نے حرام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دل میں جو اعتقاد وغیرہ ہو اس کو دوسرے کے سامنے ظاہر کرنے سے ڈرنے اور بچنے کا نام تقیہ ہے۔(فتح الباری پارہ ۲۸ ص ۴۵۱)

اکتیسویں دلیل: علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: قال ابن بطال تبعا لابن المنذر اجمعوا علی من اکرہ علی الکفر حتی خشی علی نفسہ القتل فکفر و قلبہ مطمئن بالایمان انہ لا یحکم علیہ صار مرتدا او بانت منہ امرأتہ ولو کان فی الباطن مسلما قال و ھذا قول یغنی حکایتہ عن الرد علیہ لمخالفتہ النصوص یعنی ابن المنذر کی موافقت میں ابن بطال نے کہا ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو شخص کفر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳)

قلمبند ہو کر مامون کے پاس بھیج دیئے گئے۔اس کے جواب میں مامون نے جو کچھ لکھا وہ اس کے جنون مذہبی کا ہذیان تھا۔تمام محدثین اور فقہاء میں سے ایک بھی نہیں بچا جس پر رشوت۔ چوری۔ دروغ گوئی۔ بے علمی۔ حماقت شعاری کا الزام نہیں لگایا گیا تھا۔فرمان میں یہ چنگیزی حکم بھی تھا کہ جو لوگ اس عقیدہ سے باز نہ آئیں پا بہ زنجیر روانہ کئے جائیں تا کہ میں خود اپنے سامنے اتمام حجت کر کے ان کی موت وحیاۃ کا فیصلہ کروں۔اسحاق نے یہ فرمان مجمع عام میں پڑھکر سنایا جس کی ہیبت نے بڑے بڑے ثابت قدموں کے عزم کو غیر متزلزل کر دیا اور سب کے سب سچائی اور آزادی کو خیر باد کہہ کر مامون کے ہمزبان ہو گئے۔علامہ قواریری وسجادۃ اللہ کسی قدر مستقل رہے مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور ایک رات اسی سختی میں گذری تو ثابت ہو گیا کہ ان لوگوں کو اپنے عزم واستقلال کی نسبت جو حسن ظن تھا وہ صحیح نہ تھا۔صرف امام حنبل ومحمد بن نوح اس معرکہ میں ثابت قدم رہے جس کے صلہ میں پابہ زنجیر ہو کر طرسوس روانہ کر دیئے گئے۔

مامون کو پھر معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس مسئلہ کو تسلیم کر لیا تھا تقیہ کیا تھا وہ نہایت برافروختہ ہوا اور ان لوگوں کی نسبت حکم دیا کہ آستانہ دولت پر حاضر کئے جائیں۔ایک جم غفیر جسمیں ابو حسان زیادی' نصر بن شمیل' قواریری' ابو نصر تمار' علی بن مقاتل' بشر بن الولید وغیرہ شامل تھے۔پولیس کی حراست میں شام کو روانہ کیا گیا۔یہ لوگ رقہ تک پہنچے تھے کہ مامون کے مرنے کی خبر آئی (المامون ص ۲۳۴)

ظاہر کرنے پر مجبور کیا جائے یہاں تک کہ اس کو خوف ہو کہ اگر کفر ظاہر نہیں کرے گا تو قتل کر دیا جائے گا وہ اگر زبان سے کفر ظاہر کر دے مگر دل میں پورا ایمان رکھے تو اس کو کافر نہیں کہا جائیگا اور نہ اس سے اس کی زوجہ الگ کی جائے گی۔ اس اجماع میں محمد بن الحسن داخل نہیں ہیں کیونکہ ان کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جان کے خوف سے بھی صرف زبان سے کفر ظاہر کر دے گا تو مرتد ہو جائے گا اور اس کی زوجہ اس سے الگ کر دی جائے گی اگرچہ وہ دل سے مسلمان ہی ہو۔ یہ قول نقل کر کے ابن بطال کہتے ہیں کہ محمد بن الحسن کا یہ قول اس قدر لغو ہے کہ اس کا صرف نقل کر دینا کافی ہے۔ اس کے جواب دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ قرآن و حدیث کے صاف صاف احکام کے خلاف ہے۔ (فتح الباری پارہ ۲۸ ص ۴۵۱) اس بیان سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ خوف کی حالت میں کفر کا زبانی اقرار کر دینا جائز ہے اور جو شخص اس اجماع کے خلاف کوئی بات کہے وہ ایسی مہمل اور پوچ بات کہیگا جس کے جواب کی ضرورت نہیں (کیونکہ جواب جاہلاں باشد خموشی)۔ علامہ ابن حجر نے اس کے بعد لکھا ہے: وقال قوم محل الرخصة فی القول دون الفعل کان یسجد للصنم او یقتل مسلما او یاکل الخنزیر او یزنی و ھو قول الاوزاعه و سحنون و اخرج اسمعیل القاضی بسند صحیح عن الحسن انه لا یجعل التقیة فی النفس المحرمة و قالت طائفة الاکراہ فی القول والفعل سواء۔ یعنی ایک جماعت کا قول ہے کہ تقیہ کی اجازت صرف زبان سے کہنے میں ہے کام کرنے میں نہیں ہے۔ مثلاً (یہ جائز ہے کہ کہہ دے میرا مذہب یہ ہے۔ میرا اعتقاد ایسا ہے مگر) تقیہ کر کے کوئی کام ہاتھ پاؤں وغیرہ سے نہیں کر سکتا جیسے بت کو سجدہ کرنا یا مسلمان کو قتل کرنا یا سور کا

گوشت کھانا یا زنا کرنا وغیرہ جائز نہیں ہے اور یہ قول اوزاعی اور سحنون کا ہے اور اسمعیل قاضی نے سند صحیح کے ساتھ حسن سے روایت کی ہے کہ کسی شخص کے قتل کے بارے میں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ مجبوراً تقیہ کرنا جس طرح زبان سے کہنے میں جائز ہے اسی طرح کام کرنے میں بھی صحیح ہے (فتح الباری پارہ ۲۸ ص ۴۵۱) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرات اہل سنت کی ایک جماعت افعال مثلاً بتوں کے سجدہ کرنے، مسلمان کے قتل کرنے، سور کا گوشت کھانے، زنا کرنے وغیرہ حرام امور میں بھی تقیہ کو جائز جانتی ہے۔ اور زبان سے کہنے اور ہاتھ پاؤں سے کرنے میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔

بتیسویں دلیل۔ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے: روی عون عن الحسن انه قال التقية جائزة للمومنین الی یوم القیامة و هذا القول اولی لانه دفع الضرر عن النفس واجب بقدر الامکان۔ یعنی عون نے حسن سے روایت کی ہے کہ مومنین کے لئے قیامت تک تقیہ جائز ہے اور یہی قول بہتر ہے اس لئے کہ جہاں تک ممکن ہو جان کا بچانا اور اس سے ضرر کا دفع کرنا واجب ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۶۴۶)

تیتیسویں دلیل۔ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے: التقية جائزة لصون النفس و هل تجوز لصون المال یحتمل ان یکون الحکم فیها بالجواز لقوله علیه السلام کحرمة دمه ۔ ولقوله علیه الصلوٰة والسلام من قتل دون ماله فهو شهید و لان الحاجة الی المال شدیدة والماء ان بیع بالغبن سقط فرض الوضوء وجاز الاقتصار علی التیمم دفعا لذلك القدر من نقصان المال فکیف لا یجوز ههنا والله اعلم یعنی جان بچانے کے لئے تقیہ کرنا جائز ہے۔ اور مال کی حفاظت کے لئے بھی

جائز ہے یا نہیں تو احتمال ہے کہ اس کے لئے بھی جائز ہو کیونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلم کے مال کی عزت اس کے خون کی عزت ایسی ہے اور یہ بھی حضرتؑ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید کا درجہ پائے گا اور اس سبب سے بھی کہ مال کی حاجت شدید ہوتی ہے اور پانی اگر نقصان کے ساتھ بکتا ہو یعنی اس کی اتنی قیمت ہو جس کے دینے میں مالی نقصان ہو تو وضوء کا فرض ساقط اور تیمم جائز ہو جاتا ہے تاکہ انسان مال کے اتنے نقصان میں بھی مبتلا نہ ہو۔ پھر پورے مال کی حفاظت میں تقیہ کیوں جائز نہیں ہوگا۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۶۴۶) امام رازی کے اس قول سے معلوم ہوا کہ مال بچانے کے لئے تقیہ کرنا بھی جائز ہے۔

چونتیسویں دلیل۔ کتاب فتاوی قاضی خان میں لکھا ہے: رجل دعاہ الامیر یسئل عن اسیاء ان تکلم بما یوافق الشرع یصیبہ مکروہ فانہ لا ینبغی لہ ان یتکلم بما یخالف الحق۔ ھذا اذا کان لا یخاف القتل علی نفسہ ولا اتلاف عضو ولا یخاف علی مالہ فان خاف ذلک فانہ لا یا بس۔ یعنی اگر حاکم نے کسی شخص کو بلا کر اس سے کچھ باتیں دریافت کیں جن کا جواب وہ شرع کے موافق دیتا ہے تو حاکم اس پر ظلم کرتا ہے۔ اس صورت میں اس شخص کو جائز نہیں ہے کہ خلاف حق جواب دے (بلکہ اس ظلم کو برداشت کرے مگر شرع کے موافق ہی جواب دے) مگر یہ فتویٰ اس صورت کا ہے جب اس شخص کو اس کا خوف نہ ہو کہ موافق حق کہنے سے وہ قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا یا اس کا مال ضائع ہوگا لیکن اگر ان باتوں کا خوف ہو تو اس کو جائز ہے کہ اس حاکم کے جواب میں شرع اور حق کے خلاف باتیں کہہ دے (تاکہ وہ قتل سے بچ جائے اور اس کا بدن درست رہے اور اس

کا مال محفوظ رہے) انتہیٰ۔ اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ قتل ہونے یا بدن کا کوئی ٹکڑہ کٹنے یا مال ضائع ہونے کا خوف ہو تو تقیہ جائز ہے۔

پینتیسویں دلیل۔ علامہ حموی نے لکھا ہے: فی شرح العینی للبخاری فی باب شراء المملوك من الحربی فی حدیث قتیبة عن اللیث بن سعد مانصه وفیه ای الحدیث الحیل فی التخلیص من الظلم بل اذا علم انه لا یتخلص الا بالکذب جاز له الکذب الصریح وقد یجب فی بعض الصور بالاتفاق ککونه ینجی نبیا او ولیا ممن یرید قتله او لنجاة المسلمین من عدوهم و قال الفقهاء لو طلب ظالم ودیعة لانسان لیاخذها غصبا وجب علیه الانکار والکذب فی انه لا یعلم موضعها انتهی۔ یعنی صحیح بخاری کی جو شرح علامہ عینی نے (عمدۃ القاری نامی) لکھی ہے اس میں باب شراء المملوک من الحربی کے بیان میں قتیبہ کی حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ اس حدیث میں ظالموں سے بچنے کے حیلے موجود ہیں بلکہ جس وقت کسی شخص کو معلوم ہو کہ وہ بغیر جھوٹ بولے اس مصیبت سے نہیں نکل سکتا تو اس کو صاف صاف جھوٹ بولنا جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو تمام اہل سنت کا اتفاق ہے کہ جھوٹ بولنا واجب ہے۔ جیسے کوئی ظالم کسی نبی یا ولی کو قتل کرنا چاہے تو جھوٹ بولنا واجب ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو ان کے دشمنوں سے بچانے کے لئے بھی جھوٹ بولنا واجب ہے اور بڑے پیشوایان مذہب نے کہا ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی شخص کی امانت مانگے اس غرض سے کہ اس پر زبردستی قبضہ کرلے تو جس شخص کے پاس وہ امانت ہے اس پر واجب ہے کہ جھوٹ بولے اور صاف صاف انکار کر کے کہہ دے کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ امانت کہاں ہے (شرح اشباہ و نظائر و عمدۃ القاری جلد) اور امام غزالی نے لکھا

ہے: من تبع ولیا من اولیاء اللہ لیقتلہ وقد اختفی منہ فی موضع حریز اذا سال الظالم عن محلہ لم یجز تنبیہہ بل وجب الکذب فیہ ۔ یعنی اگر کوئی ظالم کسی ولی خدا کے پیچھے پڑ جائے اور اس کے قتل کرنے کے لئے اس کی تلاش کرے اور وہ ولی اس ظالم سے کسی محفوظ مقام میں چھپ گیا ہو تو وہ ظالم اس ولی کے بارے میں جن لوگوں سے پوچھے ان کے لئے اس کا پتا بتانا جائز نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ وہ لوگ اس بارے میں جھوٹ بول دیں (احیاء العلوم جلد ۳ ص ۱۴۷) اور علامہ حموی نے لکھا ہے: فی مجمع الفتاوی ان الکذب یباح لاحیاء حقہ ولدفع الظلم عن نفسہ کالشفیع یعلم بالبیع فی جوف اللیل فاذا اصبح یشھد و یقول علمت الان کذا الصغیرۃ تبلغ فی جوف اللیل و تختار نفسہا من الزوج و تقول رائت الدم الآن ۔ یعنی مجمع الفتاوئ میں ہے کہ اپنے حق کے زندہ کرنے اور اپنے نفس سے ظلم دفع کرنے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے مثلاً جس شخص کو حق شفعہ مانپہنچتا ہے اس کو معلوم ہوا کہ اندھیری رات میں فلاں زمین بیچی گئی ہے۔ پس جب صبح ہو تو وہ گواہی دیدے اور جھوٹ کہہ دے کہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔ اسی طرح کوئی نابالغ لڑکی اندھیری رات میں بالغ ہو جائے تو وہ صبح کے وقت اپنے نفس کو شوہر سے اختیار کرے اور (جھوٹ) کہہ دے کہ میں نے ابھی خون (حیض) دیکھا ہے۔ (اشباہ و نظائر)

چھتیسویں دلیل۔ تلویح حاشیہ توضیح میں ہے:

قال الامام الزعری ان فعل المکرہ مباح کالقتل والزنا و فرض کشرب الخمر واکل المیتۃ ومرخص لہ کاجراء کلمۃ الکفر والافطار و اتلاف مال الغیر۔

یعنی امام زعری نے کہا ہے کہ جو شخص کسی کام پر مجبور ہو جائے اس کا وہ کام کبھی مباح ہے جیسے کسی کو قتل کر دینا یا زنا کرنا اور کبھی واجب ہے جیسے شراب پینا مردار کھانا اور کبھی معاف ہے جیسے کفر کا کلمہ زبان پر جاری کر دینا یا روزہ توڑ دینا یا دوسرے کا مال تلف کر دینا۔ اسی کتاب میں یہ بھی ہے

قوله والاکراه الملجی یبیحها ای یبیح المحرمات حرمة تحتمل السقوط لانه قد استثنی عن الحرج المیتة و نحوها حالة الاضطرار بمعنی انه لا یثبت الحرمة فیها فیبقی الاباحة الاصلیة ضرورة والاکراه الملجی بخوف تلف النفس او العضو نوع من الاضطرار وان اختص الاضطرار بالمخمصة یثبت فی الاکراه بدلالة النص لما فیه من خوف فوات النفس او العضو فلو امتنع المکره عن اکل المیتة و نحوها حتی قتل کان آثما ان کان عالما بسقوط الحرمة ان لم یعلم فیرجی ان لا یکون آثما۔ کذا فی المبسوط۔ یعنی ایسی زبردستی جس میں انسان مجبور ہو جائے حرام کاموں کو جائز کر دیتی ہے یعنی ان چیزوں کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ مجبوری کی حالت میں تحریم میتہ وغیرہ سے وہ مستثنیٰ ہوتی ہے بایں معنی کہ ان چیزوں میں حرمت ثابت ہی نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا اصلی اباحت (جائز ہونا) باقی رہتی ہے جو بالکل واضح ہے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور زبردستی جو انسان کو مجبور کر دے کہ اس کو اپنی جان جانے یا بدن کے کٹنے کا خوف ہو تو یہ بھی ایک قسم کا اضطرار ہے یعنی وہ زبردستی جو انسان کو مجبور کر دے حرام کاموں کو حلال کر دیتی ہے وہ حرمت جس کے بارے میں ساقط ہونے کا احتمال ہو کیونکہ حالت مجبوری میں مردار کے حرام ہونے وغیرہ صورتوں سے وہ مستثنیٰ ہے۔ بایں معنی کہ اس میں حرمت ثابت ہی نہیں ہوتی۔ پس واضح ہے کہ اس کی اباحت (حلال ہونا)

باقی رہتی ہے۔ اور وہ زبردستی جو انسان کو اس طرح مجبور کر دے کہ اگر وہ اس کام کو نہیں کرے گا تو اس کی جان جاتی رہیگی یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا یہ بھی اضطرار کی ایک قسم ہے اور اگر اضطرار بھوک سے مخصوص ہو تو وہ زبردستی میں بھی ثابت ہوگا کیونکہ اس کے بارے میں تو نص ہے کہ اگر جان جائے یا بدن کٹنے کا خوف ہو تو اس کام کو کرلو۔ پس اگر کوئی شخص اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ مردار کھائے یا شراب پیئے ورنہ قتل کیا جائے گا اور وہ شخص مردار نہ کھائے یا شراب نہ پیئے (جس کی وجہ سے قتل کیا جائے یا اس کا بدن کاٹا جائے) تو وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس کو معلوم ہو کہ ایسی حالت میں اس مردار وغیرہ کی حرمت اس سے ساقط ہوگئی ہے لیکن اگر اس کو یہ معلوم نہ ہو تو امید ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ اسی طرح کتاب مبسوط میں لکھا ہے (تلویح حاشیہ توضیح) اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

واجر کلمته الکفر صورة اذالاحکام متعلقة بالظاهر فیکون حراما ابدا لامن اکره وقلبه مطمئن بالایمان یعنی کفر کا کلمہ زبان پر جاری کرنا کفر کی صورت اختیار کرنا ہے۔ کیونکہ احکام کا تعلق تو صرف ظاہری حالت سے ہوتا ہے (پس جو شخص کفر ظاہر کر رہا ہے وہ ظاہراً کافر ہی معلوم ہوگا) لہذا کفر کا کلمہ زبان پر جاری کرنا ہمیشہ حرام ہی ہے۔ البتہ جو شخص کفر کا کلمہ جاری کرنے پر مجبور کر دیا جائے مگر اس کے دل میں ایمان بھرا ہوا اس کے لئے کوئی حرج نہیں نہ اس کو ایسا کلمہ جاری کرنا حرام ہے۔

سینتیسویں دلیل۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی جو دعا لکھی ہے کہ: واغفر لابی انه کان من الضالین اے اللہ تو میرے باپ کو بخش دے کہ وہ گمراہ تھے۔ (پارہ ۱۹ رکوع) اس کی تفسیر میں علامہ بیضاوی نے لکھا ہے: وان کان هذا الدعاء بعد موته فلعله کان یظنه انه کان یخفی

الایمان من نمرود تقیہ ولذلك وعدہ یعنی حضرت ابراہیم کی یہ دعا اگر ان کے باپ آذر کے مرنے پر تھی تو ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا گمان یہ ہو کہ وہ (آذر) نمرود سے تقیہ کر کے اپنا ایمان چھپائے رکھتا تھا اور اسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان (آذر) سے وعدہ کرلیا ہو کہ میں آپ کے لئے دعا کروں گا (تفسیر بیضاوی جلد ۲ ص ۱۰۸) اور یہ آذر بت پرست تھا۔ چنانچہ خود خدا نے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کو قرآن مجید میں نقل کیا ہے کہ آپ نے آذر سے فرمایا: **یاابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا۔** یعنی اے بابا آپ ایسی چیز کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ آپ کو کسی قسم کا نفع پہنچا سکتی ہے (پارہ ۱۶ ع ۷۶)۔ حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں آذر نے کہا تھا: **ارغب انت عن آلھتی یا ابراھیم لئن لم تنتہ لا رجمنك واھجرنی ملیا** یعنی اے ابراہیمؑ تم ہمارے معبودوں سے نفرت کرتے ہو۔ اگر تم اس بات سے باز نہیں آؤ گے تو میں ضرور تم کو سنگسار کردوں گا اب تم میرے سامنے سے دور ہو (پارہ ۱۶ ع ۶) اور شیعوں کے ہاں صرف نقصان سے بچنے اور ظلم سے محفوظ رہنے کے لئے تقیہ کرنا جائز ہے کسی نفع کے حاصل کرنے یا لذت لوٹنے کے لئے تقیہ کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن آذر تو بتوں کو بیچ کر ان کی تجارت سے نفع بھی حاصل کر سکتا تھا (پس جب اس کے لئے تقیہ جائز تھا تو پھر ہمارے لئے کیوں نہیں جائز ہوگا)۔

اڑتیسویں دلیل۔ خدا نے قرآن مجید میں حضرت رسول خدا ﷺ سے فرمایا ہے: **الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون** یعنی آج کے دن کافر لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے پس اب تم ان سے نہ ڈرنا اور صرف مجھ ہی سے ڈرنا (پارہ ۶ ع ۵)

اس کی تفسیر میں علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے: قال قوم الآیۃ والۃ علی ان التقیہ جائزۃ عند الخوف و قالوا انہ تعالیٰ امرھم باظہار ھذہ الشرائع واظہار العمل بہا و علق ذلک بزوال الخوف من جہتہ الکفار وھذا یدل علی ان عند قیام الخوف یجوز ترکہا یعنی اہل سنت کی ایک بڑی جماعت کا اعتقاد ہے کہ یہ آیۃ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ڈر کے وقت تقیہ کرنا جائز ہے اوران لوگوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ان شریعتوں کو ظاہر کریں اوران پر عمل بھی ظاہر بظاہر کریں مگر اس کے لئے یہ شرط عائد کردی کہ اسی وقت ایسا کریں جب ان باتوں کے ظاہر کرنے میں کافروں کی طرف سے کوئی خوف نہ ہو۔ اور یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جب کافروں کی طرف سے خوف ہو تو نہ ان شریعتوں کو ظاہر کریں نہ ظاہر بظاہر ان پر عمل کریں (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۵۲۷)

انتالیسویں دلیل۔ علامہ فخر الدین رازی نے قرآن مجید کی اس آیۃ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ یعنی پھر جب حضرت ابراہیمؑ پر رات چھا گئی اور آپ نے ایک ستارہ کو دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے فرمایا میں ڈوبنے والی چیزوں کو تو پسند ہی نہیں کرتا (پارہ ۷ ع ۱۵) کی تفسیر میں علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے:۔ الوجہ السادس انہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یبطل قولھم بربوبیۃ الکواکب الا انہ علیہ السلام کان قد عرف من تقلیدھم لا سوفھم و بعد طباعھم عن قبول الدلائل انہ لو صرح بالدعوۃ الی اللہ لم یقبلوہ ولم یلتفتوا الیہ فمال الی طریق بہا یستدرجھم الی استماع الحجۃ و ذلک بان ذکر کلاما یوھم کونہ

مساعدا على مذهبهم بربوبية الكواكب مع ان قلبه كان مطمئنا بالايمان وا مقصوده من ذلك ان يتمكن من ذكر الدليل على ابطاله وفاده وان يقبلوا قوله و تمام التقرير انه لما لم يجد الى الدعوة طريقا سوى هذا الطريق وكان عليه السلام مامورا بالدعوة الى الله تعالىٰ كان بمنزلة المكره على كلمته الكفر و معلوم ان عند الاكراه يجوز اجراء كلمة الكفر على اللّسان قال الله تعالىٰ الامن اكره و قلبه مطمئن بالايمان واذا جاز ذكر كلمة الكفر لمصلحة بقاء شخص واحد فان يجوز اظهار كلمة الكفر لتغليص عالم من التلاء عن الكفر والعقاب المويد كان ذلك اولى وايضاً المكره على ترك الصلوة لو صلّى حتى قتل استحق الاجر العظيم ثم اذا جاء وقت القتال مع الكفار علم انه لو اشتغل بالصّلوة انهزم عسكر الاسلام فههنا يجب عليه ترك الصلوة والاشتغال بالقتال حتى لو صلّى و ترك القتال اثم ولو ترك الصلوة و قاتل استحق الثواب بل نقول ان من كان فى الصلوة فرائى طفلا او عمى اشرف على غرق او حرق وجب عليه قطع الصلوة لا نقاذ ذلك الطفل و ذلك الاعمى عن ذلك البلاء فكذا ههنا ان ابراهيم عليه السلام تكلم بهذه الكلمة ليظهر من نفسه موافقة القوم حتى اذا اورد عليهم الدليل المبطل لقولهم كان قبولهم لذلك الدليل اتم وانتفاعهم باستماعه اكمل ومما يقوى هذا الوجه انه تعالى حكى عنه مثل هذا الطريق فى موضع اخر و هو قوله تعالى فنظر نظرةً فى النجوم فقال انى سقيم فتولّوا عنه مدبرين وذلك الانهم كانوا يستدلون بعلم النجوم على حصول الحوادث المستقبلة فوافقهم

علی هذا الطریق فی الظاهر مع انه کان برئیا فی الباطن و مقصوده ان یتوسل بهذا الطریق الی کسر الاصنام فاذا جازت الموافقة فی الظاهر ههنا مع انه کان برئیا فی الباطن فلم لا یجوز ان یکون فی مسئلتنا کذلک انتهی

یعنی اس آیہ کی تفسیر میں چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات اس غرض سے فرمائی کہ آپ کی قوم ستاروں کو خدا مانتی تھی تو آپ نے ان کے اس عقیدہ کو غلط ثابت کرنا چاہا مگر چونکہ حضرت کو اس قوم کی حالت معلوم تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کے اعتقادات کی سختی سے پابند اور ان کے مذہب پر مضبوطی سے قائم ہے اور ان کی طبیعتیں عقلی دلیلوں کو جلد قبول نہیں کرینگی اس وجہ سے حضرت نے خیال فرمایا کہ اگر ان کو کھلم کھلا ان کے مذہب سے الگ کرنے اور سچے دین (اسلام) کی طرف لانے کی کوشش کرینگے تو یہ کبھی قبول نہیں کرینگے بلکہ حضرت کی بات بھی نہیں سنیں گے اور کسی طرح اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی۔ لہٰذا حضرت نے کمال دانشمندی سے ایسا طریقہ اختیار فرمایا جس سے وہ لوگ حضرت کی باتوں کو اطمینان سے سن سکیں اور رفتہ رفتہ اسکی خوبی اور معقولیت کی جانب انکا ذہن متوجہ ہو سکے۔

اسی سبب سے حضرت نے ایک ایسی بات کہی جس نے ان لوگوں کے دماغ میں یہ غلط خیال پیدا کر دیا کہ حضرت ابراہیمؑ بھی ان کے ہم مذہب ہی ہیں اور انکی طرح حضرت بھی ستاروں کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ حالانکہ باطناً حضرت ان باتوں کو غلط مانتے تھے اور آپ کے دل میں پورا ایمان بھرا ہوا تھا اور ان باتوں سے حضرت کا مقصود یہ تھا کہ ان لوگوں کے دماغ کو پہلے اس قابل کر دیں کہ جب ان کے ستارہ پرستی کے عقیدہ کو غلط اور باطل کہیں تو یہ اس

کو سمجھ سکیں اور حضرت ان کو جو نصیحت اور وعظ و ہدایت فرمائیں اس کو قبول کرلیں۔ اس کو اور واضح طور پر اس طرح سمجھنا چاہیے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ اپنی جاہل اور گمراہ قوم کی ہدایت کریں۔ مگر حضرت کو اس صورت کے سوا (کہ بظاہر ان کے ہم خیال اور ہم مذہب بن جائیں) اس قوم کی ہدایت وارشاد کی اور کوئی صورت ملتی ہی نہیں تھی تو اب حضرت گویا کفر کا کلمہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے (یعنی خدا نے حضرت کو حکم دیا کہ تم اپنی قوم کو سیدھے مذہب پر لاؤ۔ اس وجہ سے اس کو سیدھے مذہب پر لانا ضروری تھا اور قوم سوا اس صورت کے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے ان کے بتوں اور ستاروں کو خدا کہہ کر ان کا دل اپنی مٹھی میں لے لیں دوسری صورت سے حضرت کی بات تک سننے کے لئے آمادہ نہیں تھی) اور یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے جس کو سب جانتے ہیں کہ مجبوری اور بے اختیاری کی حالت میں کفر کا کلمہ صرف زبان پر جاری کر دینا جائز ہے جس کو خود خدا نے بھی صاف صاف فرمادیا ہے کہ:

إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ

(سوا اس شخص کے جو کفر ظاہر کرنے پر مجبور کر دیا جائے مگر اس کے دل میں پورا ایمان بھرا ہو کہ ایسے شخص کے کفر ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (پ ۱۴ ع ۲۰)

پس جب صرف ایک شخص کی جان بچنے کے لئے اس کو اجازت دی گئی کہ اپنی زبان سے کفر کا کلمہ جاری کر دے تو پھر پورے عالم کے عقل والوں کو بے دینی۔ گمراہی اور ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب جہنم سے بچانے کے لئے کفر کا کلمہ ظاہر کر دینا کیوں جائز نہیں ہوگا؟ بلکہ ایسی حالت میں تو اس کلمہ کفر کا ظاہر کرنا پہلی

صورت سے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے کیونکہ پہلی صورت میں کفر بولنے سے تمام دنیا کے دائمی عذاب جہنم سے بچ جانے کی امید ہو جاتی ہے۔ اس کو اور بہتر طریقہ پر اس طرح سمجھو کہ اگر کوئی ظالم کسی مومن پر دباؤ ڈالے کہ تم نماز نہ پڑھو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا اور وہ مومن اپنی جان کی پرواہ نہ کر کے نماز پڑھ لے اور قتل کر دیا جائے تو وہ بہت بڑے ثواب کا مستحق ہوگا (کہ اس نے خدا کی عبادت کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی) لیکن اگر کافروں سے کسی لڑائی کا موقع ہو اور اس مومن کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ خود نماز پڑھنے لگے گا تو اسلام کے لشکر کو شکست ہو جائیگی ایسی صورت میں اس مومن پر واجب ہے کہ نماز چھوڑ دے اور کافروں سے جہاد میں مشغول ہو جائے لیکن اگر وہ نماز نہ چھوڑے اور اس وقت بھی جہاد سے الگ ہی رہے تو گنہگار ہوگا۔ اس کے خلاف اگر نماز چھوڑ دے اور جہاد کرے تو ثواب کا مستحق ہوگا۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی لڑکا یا اندھا کنویں کے قریب پہنچ گیا جس میں گرا چاہتا ہے یا کسی طرح آگ میں جلا چاہتا ہے تو نماز پڑھنے والے پر واجب ہے کہ نماز توڑ دے اور اس لڑکے یا اندھے کو اس مصیبت سے نکال لے۔

بالکل اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس مصلحۃ سے کفر کا کلمہ کہا کہ حضرت کی قوم آپ سے مانوس رہے اور سمجھے کہ آپ ان لوگوں کے مذہب پر ہیں اور آپ کو اپنا مخالف نہ سمجھے تا کہ پھر حضرت ان کی بھلائی کی جو بات کہیں اسے اطمینان سے سنے اور اسکے باطل مذہب کی جو خرابی بیان کریں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور اسکی گمراہی کی جو دلیلیں پیش کریں اس کو آسانی سے قبول کرے پس ان کامیابیوں کے حاصل کرنے کے لئے حضرت

ابراہیمؑ نے یہ بہترین تدبیر اختیار کی کہ اس قوم کے موافق ہو کر اور اس کے اندر رہ کر اس کے مذہب کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے آپکی دلیلیں زیادہ موثر ہو گئیں اور آپکی قوم ان دلیلوں کو سن کر بہت زیادہ نفع پا سکی اور اسکی ہدایت کا زیادہ مکمل انتظام ہو سکا۔

چنانچہ ہمارے بیان کی تائید خدا کے دوسرے قول سے ہوتی ہے۔ وہ بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کے بارے میں خدا نے دوسری جگہ فرمایا ہے: فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم فتولوا عنه مدبرین یعنی پھر حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی رفتار میں نظر کر کے فرمایا کہ میں بیمار ہوں تو کافر لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے (پ ۲۳۔ ع ۷) اور حضرت نے یہ بات اس وجہ سے فرمائی تھی کہ وہ لوگ علم نجوم سے آئندہ ہونے والے واقعات پر استدلال کرتے تھے (جیسا ان دنوں بھی ہند میں کتنی قومیں علم نجوم کی پیشین گوئیوں کو سچی جانتی ہیں)۔ لہذا حضرت نے بھی ظاہر میں ان کے اسی مذاق کے مطابق ان کی موافقت کی یعنی یہ ظاہر کیا کہ آپ ستاروں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ بیمار ہو جائیں گے یا بیمار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ دل میں آپ ان کل خیالات سے علیحدہ تھے پس اس تدبیر کو حضرت نے صرف اُس غرض سے اختیار کیا کہ اس سے انکے بتوں کو توڑنے کی راہ نکل آئے۔ غرض جب اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے لئے یہ جائز ہوا کہ اپنے کو کافروں کے موافق اور انکا ہم مذہب ظاہر کریں حالانکہ آپ دل میں ان عقائد سے الگ تھے۔ تو پھر ہم جو بحث کر رہے ہیں (کہ حضرت نے ستارے کو اپنا معبود صرف اس غرض سے ظاہر کیا کہ وہ کفار حضرت کو اپنا ہم مذہب سمجھ کر آپ کی باتیں سنیں) اس میں حضرت کو اپنے اصلی عقیدے کے خلاف ظاہر کرنا کیوں جائز نہیں سمجھا جائے گا۔

انتہی (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۱۱۲) علامہ فخر الدین رازی کی اس عبارت سے کتنا عظیم الشان فائدہ حاصل ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ ضرورۃ اور مصلحت کے وقت کفر کا جو کلمہ بولے اور ایمان کے خلاف باتیں ظاہر کیں۔ انکو علامہ موصوف نے جائز رکھا پس علامہ توشجی وغیرہ نے شیعوں پر جو اعتراض وارد کیا ہے کہ "یہ (شیعہ) کہتے ہیں کہ انبیاء بھی تقیہ کر کے کفر ظاہر کرتے تھے۔ اگر صحیح مان بھی لیا جائے[1] تو خود بخود ساقط ہو گیا۔

چالیسویں دلیل: حضرات اہل سنت کے پیشوائے اعظم شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اپنی کتاب میں جہاں لکھا ہے کہ خلافت ثابت ہونے کی ایک صورت استیلاء (زبردستی غلبہ کر لینے کی) بھی ہے وہاں تحریر فرمایا ہے:

دیگر آنکہ مستجمع شروط نہ باشد و صرف منازعین کند بقتال و ارتکاب محرم و آں جائز نیست و فاعل آں عاصی است لیکن واجب است قبول احکام او چوں موافق شرع باشد و اگر عمال او اخذ زکوۃ کنند از ارباب اموال ساقط شود وچوں قاضی او حکم نماید نافذ گردد حکم او و ہمراہ او جہاد می تواں کرد این انعقاد بناء بر ضرورت است زیرا کہ در عزل او افنائے نفوس مسلمین و ظہور ھرج و مرج شدید لازم می آید یعنی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص جو زبردستی غلبہ حاصل کر کے خلیفہ بن بیٹھا ہے اس میں خلافت کی سب شرطیں تو نہ پائی جائیں لیکن اگر وہ شخص (جسکی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر) اپنی قوت سے لڑ کر یا ظلم و جور کر کے یا مکر و فریب وغیرہ حرام

---

[1] جناب مصنف علام اعلی اللہ دار لسلام کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اہل سنت جو شیعوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ انبیاء کے لئے بھی تقیہ جائز سمجھتے اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ حضرات تقیہ کر کے کفر تک ظاہر کر سکتے ہیں اس قول کی کوئی تصریح ہمارے علماء کے کلام میں نہیں ملتی اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعاً کسی شیعہ عالم نے ایسا لکھا ہے۔

صورتوں کو اختیار کر کے اپنے مقابلہ کے لڑنے والوں کو دبا دے اور حکومت پر قبضہ کر لینے میں خود تنہا کامیاب ہو جائے تو اس کا یہ فعل (یعنی اس طرح خلیفہ بن بیٹھنا) جائز نہیں ہے بلکہ وہ گنہگار ہوگا مگر دوسرے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسکے ان حکموں کو مانیں جو شرع کے موافق ہوں اور اگر مالدار لوگوں سے اس خلیفہ کے کارندے زبردستی زکوۃ وصول کریں تو ان لوگوں سے زکوۃ کا ادا کرنا ساقط بھی ہو جائیگا اور اگر وہ کوئی قاضی مقرر کرے تو اس قاضی کا حکم بھی جاری ہو جائے گا اور اس کے ساتھ دوسروں سے جہاد بھی کر سکتے ہیں اور اس قسم کی خلافت کا منعقد ہونا ضرورت کی وجہ سے ہے کیونکہ اگر ایسے ظالم خلیفہ کو ہم معزول کریں تو جنگ وخون ریزی ہوگی جس سے مسلمانوں کی جانیں ضائع ہوں گی اور سخت فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو جائیگا (ازالۃ الخفاء مقصد اول صفحہ ۶)

اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے: قد اجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه وان طاعته خير من الخروج عليه لما في ذلك من حقن الدماء وتسكين الدهماء یعنی علماء فقہاء کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جو شخص زبردستی اپنے زور سے بادشاہ بن بیٹھے اسکی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے اور اسکے ساتھ ہو کر دوسروں سے جہاد کرنا بھی واجب ہے اور بجائے اس پر خرچ کرنے کے اسکی فرماں برداری ہی میں خیریت ہے کیونکہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کا خون بچا اور فتنہ وفساد دبا رہیگا (فتح الباری جلد ۱۴ کتاب الفتن باب قول النبی ؐ ستروں بعدی اموراً ص ۲۹۶ـ)

اکتالیسویں دلیل۔ بعض علماء اہل سنت نے علامہ ابن عبد ابہ اندلسی کی کتاب عقد فرید سے نقل کیا ہے کہ: لما اتى الحجاج باسرى بجماجم اتى

فيهم لعامر الشعبی و مطرف بن عبدالله بن السحير و سعيد بن جبير و كان الشعبی و مطرف يريان التقية و كان سعيد بن جبير لا يراها وقد تقدم كتاب عبدالملك بن مروان الى الحجاج فی اسری الجماجم ان يعرضهم علی السيف فمن اقر منهم بالكفر فی خروجهم علينا فيخلی سبيله و من زعم انه مومن فيضرب عنقه فقال الحجاج للشعبی اتشهد علی نفسك بالكفر۔ فقال اصلح الله الامير تنابنا المنزل واحزن بنا الجناب و استحسلنا الخوف و اكتحلنا السهر و خبطنا فتنة لم يكن فيها بررة اتقيائو ولا فجرة اقوياء قال لله ابوك لقد صدقت ما بهرتم بخروجكم علينا ولا قويتم خلوا سبيل الشيخ۔ ثم قال لمطرف اتقر علی نفسك بالكفر۔ قال اصلح الله الامير ان من شق العصا و سفك الدماء و نكث البيعة و اخاف المسلمين لجدير بالكفر فخلی سبيله

یعنی مشہور حاکم حجاج کے ہاں مقام جماجم کے قیدی گرفتار کر کے لائے گئے تو ان میں عامر شعبی، مطرف بن عبداللہ بن سحیر اور سعید بن جبیر بھی تھے۔ ان میں عامر شعبی اور مطرف تقیہ کو جائز کہتے مگر سعید بن جبیر اس خیال کے نہیں تھے۔ اور اس سے پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان کا فرمان حجاج کے پاس اس مضمون کا آچکا تھا کہ جماجم کے قیدیوں کے سر پر تلوار رکھ کر ان سے دریافت کرو کہ انہوں نے ہم لوگوں کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس سے وہ لوگ کافر ہوئے یا نہیں۔ جو لوگ کہیں کہ ہاں کافر ہو گئے ان کو چھوڑ دو اور جو کہیں کہ کافر نہیں ہوئے انکی گردن اڑا دو۔

حجاج نے ایسا ہی کیا منجملہ ان کے شعبی سے پوچھا کہ آپ بتائیے خلیفہ کے

خلاف آپ نے بھی بغاوت کی تھی اس سبب سے کافر ہوئے یا نہیں شعبی نے جواب دیا خدا امیر کا بھلا کرے بے شک ہم لوگوں کی بغاوت کی وجہ سے وطن بے مزہ ہوگیا۔ ہمارے سبب سے گھر سونا ہوگیا۔ ہم لوگوں نے برابر خوف کی حالت میں زندگی بسر کی۔ ہر وقت کی پریشانیوں سے ہماری نیند غائب ہوگئی اور ہم لوگ ایسے فتنہ میں ٹھوکریں کھاتے رہے جس میں نہ تو پرہیز گار لوگ اپنی نیکی پر قائم رہے اور نہ بدمعاشوں ہی میں قوت رہی۔ حجاج نے کہا اللہ آپ کا بھلا کرے آپ اچھے باپ کے بیٹے ہیں آپ نے بالکل سچ کہا ہم لوگوں کے خلاف خروج کرنے سے آپ لوگ نہ نیکوکار رہے اور نہ مضبوط ہوئے (پھر اپنے سپاہیوں سے کہا) ان بزرگ کو آزاد کردو۔ اس کے بعد حجاج مطرف کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہیے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کرتے ہیں یا نہیں انہوں نے جواب دیا اللہ امیر کا بھلا کرے جو شخص آپس میں پھوٹ ڈالے یا خون ریزی کرے یا خلیفہ وقت کی بیعت توڑے اور مسلمانوں کو ڈرائے اس کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ حجاج نے ان کو بھی آزاد کردیا (العقد الفرید جلد ۲ ص ۱۴۷ باب لما اتی الحجاج بامسریٰ بجماجم) اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ شعبی اور مطرف ایسے پیشوایان اہل سنت بھی تقیہ کو جائز جانتے اور اس پر عمل کرتے تھے کیونکہ ان دونوں نے صرف قتل کے ڈر سے اپنے کفر کا اقرار کرلیا۔

بیالیسویں دلیل۔ ایک عالم اہل سنت نے بیان کیا کہ تاریخ صغیر بخاری میں لکھا ہے: حدثنی عمر بن طلحہ قال حدثنا اسباط بن نصر عن سماک جابر بن سمرۃ قال ما ابالی لو بایعتہ یعنی المختار مائتہ مرۃ۔ انما البیعۃ بالقلب۔ یعنی جابر بن سمرہ کہتے تھے کہ اگر میں مختار کی بیعت سو مرتبہ کروں تب بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہے (کیونکہ اصلی) بیعت تو دل سے

ہوتی ہے (تاریخ صغیر بخاری ص) اس سے معلوم ہوا کہ جابر بن سمرہ اس بات کے قائل تھے کہ بیعت کا تعلق دل سے ہے۔ اگر کسی کی ظاہری طور پر بیعت کر لی مگر دل سے اس کو بیعت نہیں سمجھتے تو در حقیقت وہ بیعت ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ تقیہ ہے۔ پس جو لوگ جناب امیرؑ کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضرتؑ نے جناب ابوبکر کی بیعت کر لی تھی ان کو بتانا چاہیے کہ حضرت نے ان کی بیعت دل سے کب کی تھی ضرور ظاہری بیعت تھی جسکی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بیعت کا تعلق تو دل سے ہے ا۔ انہیں عالم اہل سنت نے اس حدیث کو نقل کر کے اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ: ھذا الخبر یدل علی التقیۃ یعنی یہ حدیث تقیہ کو جائز ثابت کرتی ہے۔

تینتالیسویں دلیل۔ مذکورہ بالا عالم اہل سنت نے تاریخ صغیر بخاری سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے: حدثنی سعید بن محمد الحرصی قال حدثنا یعقوب بن ابراھیم قال حدثنا الی عن محمد بن اسحاق قال حدثنی ابو

ا۔ علامہ محب الدین سلیمانی بغدادی طوفی نے جو بڑے جلیل القدر علماء اہل سنت سے ہیں شرح اربعین محی الدین میں لکھا ہے واعلم ان النزاع الطویل بینھم فی التقیۃ استدلالا وجوابا ذھب فی الغالب ھدرا فان محل الخلاف انما ھو مبایعۃ علیؑ ابابکر تقیۃ ۔ ادعاہ الشیعۃ لما مرو نفاہ السنیۃ لانہ نفاق وھو لا ینبغی نسبتہ الی علیؑ۔ اما التقیۃ فی غیر ذلک فلا مبالاۃ باثباتھا وجوازھا و انما یکرہ عامۃ الناس لفظھا لکونھا من مستندات الشیعہ والافالعالم مجبول علی استعمالھا و بعضھم یسمیھا مداراۃ و بعضھم عقلا معیشیا۔ ودل علیھا دلیل الشرع یعنی جاننا چاہیے کہ تقیہ کے بارے میں جو اس قدر زبردست جنگ شیعوں اور سنیوں میں قائم ہے کہ وہ لوگ اس کا جائز ہونا ثابت کرتے ہیں اور اہل سنت اس کو حرام کہتے اور اس پر اعتراض کرتے ہیں یہ پوری نزاع لغو، باطل، مہمل اور بے فائدہ ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں کیونکہ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ تقیہ ہر حالت، ہر وقت، ہر جگہ اور ہر شخص کے لیے جائز ہے اور سب برابر اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ واقعی اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے تقیہ کر کے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی یا دل سے کی تھی۔ شیعوں کا دعویٰ ہے کہ حضرتؑ نے تقیہ کر کے بیعت کر لی تھی اور سنی اس سے انکار کر کے کہتے ہیں کہ یہ منافقین کا کام ہوا۔ حضرت علیؑ کی طرف اسکی نسبت کرنی بھی مناسب نہیں ہے۔ ہاں حضرت علیؑ کی بیعت کے سوا دوسرے مقامات پر تقیہ کے جائز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ تقیہ شرع سے ثابت ہے جس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ تقیہ شیعوں کے ہاں صحیح ہے اس وجہ سے عوام اہل سنت تعصب اور جہالت (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

نعیم وھب بن کیسا مولی الزبیر انه سمع جابر بن عبداللہ یقول قدم بسر بن ارطاۃ المدینه زمان معویة فقال الا ابائع رجلا من بنی مسلمة حتی یاتی جابر فاتیت ام سلمة بنت ابی امیه زوج النبیؐ فقالت بایع فقد امرت عبداللہ بن ربیعة ابن اخی ان یبایع علی ذمته وماله وانا اعلم انها بیعة ضلالة یعنی وھب بن کیسا کہتے تھے کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے سنا وہ بیان کرتے تھے کہ معاویہ کی خلافت میں بسر بن ارطاۃ مدینہ پہنچا تو کہا کہ جب تک جابر بن عبداللہ آ کر میرے ہاتھ پر معاویہ کی بیعت نہیں کرلیں گے اس وقت تک میں قبیلہ بنی سلمہ کے کسی شخص کی بیعت نہیں لونگا۔ یہ سنکر میں (جابر بن عبداللہ) حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی جناب ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور صورت حال بیان کی) موصوفہ نے فرمایا کہ تم بیعت کرلو۔ میں نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن ربیعہ کو بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان اور مال بچانے کے لئے اس کی بیعت کرلیں اگرچہ میں جانتی ہوں کہ یہ بیعت ضلالۃ (گمراہی کی بیعت) ہے۔ انتہی

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جناب ام سلمہؓ معاویہ کی بیعت کو گمراہی جانتی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴)

کی راہ میں اس کا نام لینا پسند نہیں کرتے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا بھر تقیہ کرتی ہے۔ کون شخص تقیہ سے بچ سکتا ہے۔ مگر بعض اہلسنت اپنے تقیہ کو زبان سے تقیہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں اور اس کے عوض اسی تقیہ کو مصلحت زمانہ، پالیسی، عقلی ضرورت، مقتضائے وقت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور تقیہ کو تو ناجائز کہتے مگر اسی کام کو ان ناموں سے جائز بلکہ ضروری بتاتے اور کہتے ہیں کہ شریعت نے اسی کا حکم دیا ہے۔ انتہی اب جو لوگ تقیہ کو جائز جانتے ہیں انہیں حمد و شکر بجالانا چاہیے کہ حضرات اہل سنت کے اتنے بڑے عالم نے تقیہ کے جائز ہونے کے متعلق ایسی زبردست عبارت لکھدی ہے۔ رہا علامہ محب الدین کا یہ قول کہ جناب امیرؑ نے جناب ابوبکر کی بیعت تقیہ کی راہ سے نہیں (بلکہ دل سے) کی تھی تو یہ غلط اور باطل ہے اس لئے کہ خود صحاح ستہ کی روایتوں سے ثابت ہے کہ جب جناب سیدہؑ کی وفات کے بعد حضرت امیر المومنینؑ نے لوگوں کے چہرے بدلے ہوئے پائے تو مجبوراً (ظاہراً) بیعت کرلی (صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۱ وغیرہ) اس سے زیادہ واضح دلیل کیا چاہیے جس سے یقین ہوگیا کہ جناب امیرؑ نے انکی بیعت بخوشی سے نہیں بلکہ صرف مجبوراً ظاہر طور پر کی تھی ۱۲

تھیں پھر بھی صرف جان اور مال کی حفاظت کے لئے اس کا حکم دیا جو تقیہ کے جائز ہونے کی بہت بڑی دلیل اور صریح دلیل ہے۔ چنانچہ حضرات اہل سنت کے عالم مذکور نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے: قِف علی قولها انا اعلم انها بیعة ضلالة یدل علی التقیة یعنی حضرت ام سلمہ کے قول "میں جانتی ہوں کہ یہ بیعت ضلالۃ ہے" کو خوب غور سے دیکھو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقیہ یقیناً جائز ہے۔

چوالیسویں دلیل۔

کتاب تہذیب الکمال میں ہے: عبدالله بن مسهر کان امام اهل الشام و کان اشخص الی عبدالله بن هارون یعنی المامون وهو بالرقه وابی ان یقول کلام الله مخلوق فدعا له بالسیف والنطع لیضرب عنقه فقال مخلوق فترکه من القتل انتهی

یعنی اہل شام کے امام اور پیشوا جناب عبداللہ بن مسہر خلیفہ مامون کے پاس رقہ میں بھیجے گئے تو (مامون کے امتحان لینے پر) انہوں نے قرآن مجید کو مخلوق کہنے سے انکار کیا (اور کہا کہ قرآن مجید تو قدیم ہے) اس پر مامون نے تلوار اور چمڑے کا بچھونا منگایا ا۔ تاکہ ان کو قتل کرادے یہ دیکھ کر عبداللہ نہ کہہ دیا "سرکار میں اقرار کرتا ہوں کہ قرآن شریف مخلوق ہے" تب مامون نے ان کو قتل سے بچالیا انتہی۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ جان کے خوف سے اپنے عقیدے کے خلاف غلط اعتقاد ظاہر کر دینا جائز ہے اور یہی تقیہ ہے۔ اس پر حضرات اہل سنت کے بڑے علماء اور پیشوایان دین برابر عمل کرتے رہے ہیں۔

پینتالیسویں دلیل۔ جناب مولوی فخرالدین صاحب دہلوی نے

ا۔ نطع معنے چمڑے کا بچھونا۔ عربوں کا قاعدہ تھا کہ کسی کو مارتے تو چمڑے کا ایک بچھونا بچھاتے اس پر اس کا گلا کاٹتے (انوار اللغۃ پ ۲۵ ص ۱۲) جب ایک معمولی مسئلہ خلق قرآن میں خلیفہ مامون کا یہ ظلم تھا تو مسئلہ خلافت کے بارے میں کل خلفاء اسلام کا شیعوں سے کیا برتاؤ رہا ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اپنے رسالہ میں لکھا ہے: فی تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال لعبد الغنی المقدسی قال محمد بن موسی الحرسی حدثنا یمامہ بن عبیدہ قال حدثنا عطیہ بن محارب عن یونس بن عبید قال سالت الحسن قلت یا ابا سعید انک تقول قال رسول اللہ وانک لم تدرکہ۔ قال یا ابن اخی لقد سالتنی عن شئی ما سالنی عنہ احد قبلک ولو لا منزلتک منی ما اخبرتک انی فی زمان کما تری وکان فی عمل الحجاج کل شئی سمعتنی اقولہ قال رسول اللہ ھو عن علی ابن ابی طالب غیر انی فی زمان لا استطیع ان اذکر علیا یعنی کتاب تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال میں ہے کہ یونس بن عبید بیان کرتے تھے کہ میں نے حضرت حسن بصری سے عرض کی اے ابوسعید آپ ہر حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ "حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حالانکہ آپ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے ہی نہیں پھر حضرت کی حدیث بغیر کسی واسطہ کے کس طرح بیان کرتے ہیں؟ جناب حسن بصری نے کہا "اے بھتیجے آج تم نے مجھ سے ایسی بات پوچھی جسے تمہارے پہلے کسی نے نہیں پوچھی تھی اور اگر میں تم کو اس درجہ عزیز نہیں رکھتا تو اس راز پر تم کو مطلع نہیں کرتا (اب بتا دیتا ہوں) میں جس مصیبت کے زمانہ میں ہوں اس کو تم بھی خوب دیکھتے ہو" جناب حسن بصری کا مطلب یہ تھا کہ میں حجاج کے زمانہ میں ہوں جو بنی امیہ کا ظالم گورنر ہے اسکی سفا کی اور عداوت اہلبیت "مشہور ہے۔ اس کے بعد جناب حسن بصری نے فرمایا کہ "میں جس حدیث کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا ہے اس کو در حقیقت میں نے حضرت علی ابن ابیطالب سے سنا ہے مگر میں ایسے زمانہ میں ہوں کہ حضرت علی کا نام بھی نہیں لے سکتا (کیونکہ اگر حضرت کا نام لوں تو فوراً

قتل کر دیا جاؤں۔ اسی وجہ سے ہر حدیث کو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت دے دیتا ہوں کہ حضرت کا نام لینے سے تو کوئی مجھے قتل نہیں کرے گا)" انتہی۔ اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ حسن بصری سے مشہور اور جلیل القدر تابعی حجاج کے خوف سے تقیہ کرتے اور جن حدیثوں کو حضرت امیر المومنینؑ سے سنا تھا ان کو اپنی جان کے خوف سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

اس قدر دلیلیں تقیہ کی عقلی اور مذہبی ضرورت' خوبی اور جواز ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اگر سب کو ذکر کیا جائے تو بڑی کتاب تیار ہو جائے کیونکہ وہ سب تو بے حد وحساب ہیں جن کو بالاستعیاب تلاش اور پھر جمع کرنا بھی نہایت دشوار کام ہے اور اس قدر لکھنے کے بعد باقی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اب ہم تائید خدا پر توکل کر کے اہل سنت کے ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جن کا ذکر اس رسالہ کے شروع (دیکھو رسالہ ہذا ص ۳ سطر ۶) میں ہو چکا ہے اعتراضات کے ساتھ ان کے مختصر جواب بھی لکھیں گے انشاء اللہ تعالیٰ

پہلا اعتراض

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا نے فرمایا ہے: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ یعنی مومنین کو چاہیے کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں مگر اس تدبیر سے کسی طرح سے ان سے بچنا چاہو تو خیر (پ ۳ ع ۱۱) اس سے معلوم ہوا کہ کافروں سے بچنے کے لئے ان کو دوست بنانا ناجائز ہے۔ اب شیعہ بتائیں کہ کافروں سے ڈر کر ان کا مذہب اختیار کر لینا اور اللہ پر افتراء کرنا بھی جائز ہے یا نہیں۔

اگر جائز نہیں ہے تو ہمیں کوئی مطلب نہیں لیکن اگر جائز ہے تو سورہ ممتحنہ کی ان آیات: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ الی قولہ تعالی لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔۔ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

یعنی اے اے ایمان والو:۔ تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان سے محبت سے پیش آتے ہو (تا قول خدا) جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا خدائے تعالی تم کو اس سے منع نہیں فرماتا کہ تم ان سے نیکی کرو اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ یقینا اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (پارہ ۲۸ ع ۸) سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غیر حربی کافروں کے ساتھ دوستی کرنا بغیر تقیہ کے جائز ہے جیسا کہ تفسیروں میں اس پر نص موجود ہے۔

پس چاہیے کہ ان کا مذہب اختیار کر لینا یہاں پر بھی (یعنی اس صورت میں بھی جب تقیہ کی ضرورت نہ ہو) درست ہو ورنہ دونوں مقاموں پر دونوں تفسیروں میں فرق کرنے کی وجہ بیان کرنی چاہیے کہ پہلی آیت میں بھی خدا نے کافروں سے بچنے کے لئے ان کو دوست بنانے کی اجازت دی ہے۔ پھر شیعہ صرف پہلی آیت کا مطلب یہ کیں بیان کرتے ہیں کہ کافروں کا مذہب اختیار کر لینا بھی جائز ہے اور دوسری آیت کا یہ مطلب کیوں نہیں تسلیم کرتے)

جواب

اس اعتراض سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل صاحب مناظرہ کے اصول اور طریقوں سے ناواقف ہیں اس لئے کہ اگر ہم اس کے قائل ہوں کہ پہلی آیت سے جس میں کافروں سے بچنے کے لئے تقیہ کر کے ان کو دوست بنانے کی اجازت ہے کافروں کا مذہب اختیار کر لینے اور اللہ پر افتراء کرنے کی اجازت بھی ثابت ہوتی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سورہ ممتحنہ کی دوسری آیت سے بھی بغیر کافروں سے ڈرے اور تقیہ کئے ہوئے ان کا مذہب اختیار کرنے اور اللہ پر افتراء کرنے کی اجازت ثابت ہو۔ اس لئے کہ دوسری آیت کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ غیر حربی کافروں کے ساتھ بھلائی اور انصاف کرنا چاہیے اور انسانیت کا مقتضیٰ اور اسلام کے رحم و شفقت کا اثر ہے۔ کیونکہ اسلام کی خصوصیات سے یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آیا جائے اس کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کی جائے۔ اس سے انصاف برتا جائے اور یہی آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے) رہا ان کا مذہب اختیار کر لینا اور اللہ پر افتراء کرنا تو یہ ان سے نیکی اور انصاف کرنا نہیں ہے ۱؎

بلکہ ان کو اور اپنے کو نقصان پہنچانا اور اپنے اوپر اور ان پر ظلم کرنا ہے اور اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ اس دوسری آیت کا مطلب بھی یہی ہے کہ کافروں کو دوست بنانا جائز ہے جیسا کہ معترض صاحب کا دعویٰ ہے جب بھی چونکہ

۱؎ کس کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کسی شخص کو کسی قوم پر مہربانی کرنے کی اجازت دی جائے تو اس کا یہ نتیجہ سمجھا جائے کہ وہ شخص اس قوم کا مذہب بھی اختیار کر لے۔ آج انگریزی قوم ہندوستان میں حکومت کر رہی ہے اور کل افسروں کے لئے تاکید ہے کہ ہندو مسلمانوں وغیرہ کے ساتھ بھلائی کریں۔ عدل و انصاف برتیں تو کوئی سمجھدار اس کا مطلب یہ لے سکتا ہے کہ ہر افسر کو تاکید ہے کہ وہ ہندو مسلمانوں کا مذہب اختیار کر لے۔ مسلمان بادشاہ بھی اپنی کافر رعایا پر برابر مہربانی کرتے اور انصاف سے پیش آتے تھے تو کیا اس کی وجہ سے وہ بادشاہ ان کافر رعایا کا مذہب اختیار کر لیتے تھے؟ ۱۲

مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ بغیر خوف اور تقیہ کے غیر حربی کافروں سے ایسی موالاۃ (دوستی) جائز نہیں ہے جس سے بظاہر ان کا مذہب قبول کرلینا یا اللہ پر افتراء کرنا پڑے لہٰذا سورہ ممتحنہ کی آیت کا بھی یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ کافروں کا مذہب اختیار کرلینا یا اللہ پر افتراء کرنا جائز ہے۔ رہی پہلی آیت جس میں تقیہ کر کے کافروں سے موالاۃ (دوستی) کی اجازت دی گئی ہے تو اس دوستی میں ان کا مذہب اختیار کرلینا بھی داخل رہیگا کیونکہ اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ان سے بچنے کے لئے اپنی حفاظت کی صورتیں اختیار کرلو اور زبان سے ان کے مذہب کا اقرار کرلینا بھی یقیناً حفاظت کی ایک صورت ہے لہٰذا اس صورت کو بھی اختیار کرو۔ چنانچہ اس کی تائید خدا کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو دوسری جگہ فرمایا ہے: الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان یعنی سوا اس شخص کے جو زبان سے کفر کا کلمہ کہنے پر مجبور کردیا جائے (پ ۱۴ ع ۲) کہ اسمیں بتصریح لکھا ہے کہ کسی پر زبردستی کیجائے یا کوئی مجبوری ہوجائے تو وہ کفر کا کلمہ ظاہر کرسکتا ہے۔ اور یہی ہمارا دعویٰ ہے۔ علاوہ بریں علامہ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح میں آیت تقیہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: لما تقدم الخطاب فی قوله تعالیٰ لا تتخذوا الیهود والنصاریٰ اولیاء بعضهم اولیاء بعض ومن یتولهم منکم فانه منهم کانهم اخذوابعمومه حتی انکروا علی من کان له عذر فی ذلك فنزلت هذه الآیة رخصة فی ذلك وهو کالآیات الصریح فی الزجر عن الکفر بعد الایمان ثم رخص فیه لمن اکره علی ذلك

یعنی چونکہ پہلے خدا نے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمادیا تھا کہ تم لوگ یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ لوگ تمہاری مخالفت میں ایک دوسرے کے

دوست ہیں اور تم میں سے کوئی ان کو دوست بنائیگا تو بے شک وہ بھی ان ہی میں کا ہوگا (پ۶ ع ۱۲) تو لوگوں نے اس حکم کو ہر حالت کے لئے ضروری سمجھا یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کبھی عذر یا مجبوری سے ان یہود و نصاریٰ کو دوست بناتا تھا تو اس پر بھی اعتراض کرتے تھے کہ دیکھو یہ حکم خدا کے خلاف کرتا ہے اس وجہ سے خدا نے اس آیت تقیہ کو نازل کیا جس میں کسی عذر یا مجبوری کی حالت میں تقیہ کر کے کافروں کے دوست بنانے کی اجازت دی۔ پس یہ گویا ان آیات سے ہے جو صریحی طور پر ایمان قبول کرنے کے بعد کفر سے کسی قسم کا لگاؤ رکھنے کو منع کرتی ہیں مگر جو لوگ اس میں مجبور کر دیئے جائیں یا ان پر زبردستی کی جائے ان کو اجازت بھی دیدی گئی کہ تقیہ کر کے ان کو دوست بھی بنالو اور بظاہر ان کا مذہب بھی اختیار کرلو (فتح الباری پ ۲۸ ص ۴۵۰)

دوسرا اعتراض

اگر ہم اس کو تسلیم کرلیں کہ خداوند عالم نے جس بزرگ کو اپنے لطف خاص سے اپنی حجت مقرر کیا اور جس کے قول و فعل کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا قرار دیا ان کے لئے خوف کے وقت (تقیہ کر کے) مخالفین کو دوست رکھنا اور بظاہر ان کا ہم مذہب ہوجانا بھی جائز ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس بزرگ کو خدا نے مذہب باطل کا مقابلہ اور گمراہوں کی ہدایت کرنے کے لئے مقرر کیا ہے ایسے گمراہ جو اس حجت خدا کی اچھی باتوں کے خلاف (گمراہی) ہی پسند کرنے کے عادی ہیں اور جو شخص ان کو اس (گمراہی) سے روکتا ہے اس پر ظلم کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں اس بزرگ پر واجب ہے کہ مقابلہ کے وقت ان مخالفین کی ہدایت کا فرض انجام دے اور جس شخص پر یہ واجب ہے اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ مقابلہ کے وقت اس ہدایت کی ضد

(خلاف) کی بات انہیں لوگوں کو بتائے اس لئے کہ دونوں باتیں (مقابلہ کے وقت سچے دین کی اشاعت کرنا اور تقیہ کر کے باطل مذہب کی اشاعت کرنا آپس میں) ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک وقت میں دو ضدیں جمع نہیں ہو سکتی۔ پس کیونکر اسے تسلیم کیا جائے کہ ایسے بزرگ (نبی یا امام) کو تقیہ کرنا جائز ہوگا۔ پھر کیا لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ یہ ہم کو تو (ہدایت کر کے) آخرت کی زندگی کی طرف بلاتے ہیں اور خود تقیہ کر کے دنیا کی زندگی پسند کرتے ہیں پس ایسے بزرگ کا مخالفیں کو مذہب حق کی طرف بلانا جھوٹے نبیوں اور اماموں کی طرح ہو جائیگا۔ لہٰذا یقیناً یہی نتیجہ ماننا پڑے گا کہ جس شخص کو خدا نے مخالفین کی ہدایت کے لئے مقرر کیا ہو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ مخالفین کے مقابلہ کے وقت (تقیہ کر کے) اس ہدایت کے خلاف باتیں ظاہر کرے ورنہ پھر وہ ہدایت کا فرض کیسے ادا کرے گا۔

اس کو دوسری طرح سمجھیے کہ جس شخص کو خدا نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ وہ مخالفین کو دین حق کی طرف بلائے وہ ان مخالفین سے ڈرتا ہو کہ مخالفت کے وقت یہ لوگ ظلم کرتے ہیں اور جو شخص ان مخالفین کے مقابلہ کے وقت ان کو دین حق کے خلاف دین باطل کی طرف بلائے جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے پیرو اہل سنت سے مقابلہ اور مخالفت کے موقع پر آئمہ طاہرین علیہما السلام نے حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام کر دیا۔ پس نتیجہ تو یہی نکلے گا کہ جس بزرگ کو خدا نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ مخالفین کو دین حق کی طرف بلائیں اس کے لئے جائز ہے کہ مخالفت کے وقت اس دین حق کے خلاف دین باطل کی طرف لوگوں کو بلانے لگیں لہٰذا تناقض (ایک دوسرے کے خلاف عقیدہ رکھنا) ثابت ہوگا۔ ان دونوں قیاسوں کے کس مقدمہ (حصہ) کو

آپ کہتے ہیں کہ غلط ہے جس کی وجہ سے یہ غلط نتیجہ پیدا ہوا۔ اگر دونوں صحیح ہیں تو تقیہ کس طرح بچ سکتا ہے؟

جواب

معترض صاحب نے اپنی اس منطقی تقریر میں جو طویل گفتگو کی ہے یہ در حقیقت اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان کو ہمارے عقائد کی پوری اطلاع نہیں ہے اور علماء شیعہ نے جس طرح اور جس موقع پر تقیہ کو جائز کہا ہے اس سے آپ اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے علماء نے اس بات کو واضح طور پر طے کر دیا ہے کہ کسی نبی کو تقیہ کرنا کبھی بھی جائز نہیں ہے مگر اس وقت جب وہ کل واجبی احکام اور شرائع کو بیان کر چکا ہو۔ اسی طرح امام کے لئے بھی کہ جب خدا کی حجت اسی کے قول میں معین ہو جائے اور خدا کا حکم سوا اس امام کے بتانے کے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکے تو اس (امام) کے لئے بھی تقیہ کرنا جائز نہیں ہے (یعنی جب تک نبی کل ضروری اور واجبی احکام خدا کو بیان نہ کر دے اس وقت تک اس کا تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ایسی صورت ہو کہ خدا کا حکم اور سچا مذہب صرف امام ہی کے قول اور ارشاد سے معلوم ہو سکتا ہے دوسرا کوئی ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں ہو تو اس امام کے لئے بھی تقیہ کرنا جائز نہیں ہو سکتا ہے)

لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ نبی پر جن ضروری شریعتوں اور احکام خدا کا بیان کرنا واجب تھا ان سب کو وہ بیان کر چکا اس کے بعد ایسے اسباب پیدا ہو گئے جن سے اس کو خوف ہوا کہ اگر اس وقت تقیہ کر کے کافروں کی موافقت نہیں کی جائے گی تو یہ ظلم کرینگے تب اس کو تقیہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح امام نے بھی اگر ان کل احکام کو بیان کر دیا جن کا پہنچانا اس پر واجب تھا اور اس کو

اطمینان ہو گیا کہ اب اگر وہ کسی مجبوری سے تقیہ کرے گا تو اصلی احکام خدا لوگوں سے مخفی نہیں ہونگے تب وہ بھی تقیہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ جناب علم الہدیٰ سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے لیکن مخالفین یہ جو کہتے ہیں کہ "اگر آئمہ طاہرین کے لئے تقیہ جائز ہے تو رسولؐ کے لئے بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ جس طرح نبی معصوم ہوتا ہے اسی طرح اماموں کو بھی شیعہ معصوم مانتے ہیں" تو ان کی غلطی ہے کیونکہ امام اور نبی میں فرق واضح ہے اس لئے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو نئی شریعت لاتا اور شروع شروع ہدایت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان احکام کا بتاتا ہے جو بغیر اس رسول کے بتائے معلوم نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن امام ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ انہیں احکام کو جاری رکھتا ہے جو رسول کے ذریعہ سے پہلے ہی لوگوں کو معلوم ہو چکے تھے۔ پس ان باتوں کا علم اور ان کا حق ہونا امام کے قول پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ دوسروں سے بھی ان کا پتا چل جاتا ہے۔ لہذا جب وہ کسی مجبوری کی وجہ سے تقیہ کر کے بعض احکام کو حق کے خلاف کہتا یا کرتا ہے تو اصلی حکم پوشیدہ نہیں رہتا اور مذہب حق تک رسائی آسان ہوتی ہے [۱] اور رسول و امام اگرچہ دونوں معصوم ہونے میں برابر ہیں مگر یہ تو ضروری نہیں ہے کہ تقیہ بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر جائز ہو جسکی وجہ ہم بیان کر چکے۔ اس لئے کہ یہ (تقیہ کا دونوں کے لئے یکساں طور پر جائز ہونا) تو اس وقت ہوتا جب عصمت کی وجہ سے امام کو تقیہ کرنا جائز ہوتا حالانکہ عصمت سے تقیہ جائز ہونے کو کیا ربط ہے۔ عصمت کی وجہ سے تقیہ کا نہ جائز ہونا ضروری ہے نہ حرام

۱؎ مثلاً کسی بادشاہ کے خوف سے امام نے اپنے کسی صحابی یا دوست کو حکم دیا کہ وضو میں پاؤں پر مسح نہ کرو بلکہ اس کو دھوؤ تو جو لوگ اصلی حکم خدا کے خواہاں ہوتے ہیں ان کو قرآن مجید احادیث رسولؐ سابق ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات اور خود اس امام کے پہلے بیانات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اصلی حکم وضوء میں پاؤں پر مسح کرنا ہی ہے اور اس وقت امام نے کسی خوف سے مجبور ہو کر تقیہ کیا اور اصلی حکم کے خلاف غلط عمل (پاؤں دھونے) کا حکم دیا ہے۔ ۱۲ مترجم

ہونا۔ اس پر اگر یہ کہا جائے کہ کیا شیعوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ اگر احکام خدا میں امام کا قول حجت ہے اور کیا شیعہ یہ بھی نہیں کہتے کہ ہوسکتا ہے بعض وقت ایسی حالت پیدا ہو جائے جب مذہب حق اور اصلی حکم خدا و رسولؐ کا پتا امام کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہ حاصل ہو سکے۔ مثلاً اس وقت کو جن محدثین نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا سابق ائمہ سے احکام خدا و رسول کی حدیثیں سنی ہیں وہ ان حدیثوں کو نہ بیان کریں نہ احکام خدا و رسول کو بتائیں۔ پس اس طرح امام اور رسولؐ دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح امام کے لئے تقیہ کو شیعہ جائز کہتے ہیں رسولؐ کے لئے بھی ماننا ہوگا ورنہ دونوں میں آپ کس اصول سے فرق کرسکتے ہیں۔

تو اس کے جواب میں ہم (شیعہ) کہیں گے کہ جب صورت حال واقعاً ایسی ہی ہو جائے جیسی آپ نے فرض کی ہے اور حکم خدا معلوم ہونیکا ذریعہ صرف امام کا قول ہو تو اس وقت امام کے لئے تقیہ جائز ہی نہیں ہے جس طرح رسولؐ کے لئے جائز نہیں ہے۔

اس پر اگر کہا جائے کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن احکام و شرائع کا بیان کردینا ضروری تھا ان سب کو حضرتؐ نے واضح طریقہ سے بیان کردیا تھا۔ یہاں تک کہ اب کسی حکم یا مسئلہ کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تو کیا اس حالت میں آنحضرتؐ کے لئے بعض احکام خدا میں تقیہ کرنا جائز ہوگا؟

تو ہم کہیں گے کہ ایسی حالت میں اگر رسولؐ کے لئے بھی کسی ظالم کا خوف اس قدر سخت پیدا ہو جائے جس سے تقیہ کرنا ضروری ہو تو تقیہ کرلینا جائز ہوگا بشرطیکہ اس کے تقیہ کرنے سے اصلی مذہب حق پوشیدہ نہ ہو جائے اور دوسروں کی

گمراہی نہ ہو۔ اب ہم حضرات اہل سنت سے دریافت کرتے ہیں کہ جب تقیہ کی مجبوریاں پیدا ہو جائیں تو آپ کے خیال میں کل مسلمانوں نیز امام اور حاکم وقت کو بھی تقیہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے جائز ہے مگر امام اور حاکم وقت کے لئے جائز نہیں ہے تو ہم پوچھیں گے کہ کیوں صرف مسلمانوں کے لئے جائز اور امام و حاکم وقت کے لئے ناجائز ہوگا اور آپ کس دلیل سے دونوں میں فرق کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے عقیدہ کے مطابق امام یا حاکم وقت کا قول شرعی حجت نہیں ہوتا۔ جس طرح حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت ہے جسکی وجہ سے حضرتؐ کے لئے تقیہ جائز نہیں ہے۔

اب اگر یہ کہیں کہ امام و حاکم وقت کے لئے بھی تقیہ جائز ہے تو ہم پوچھیں گے کہ جس طرح آپ نے امام و حاکم وقت کے لئے تقیہ کو جائز کہا ہے رسولؐ کے لئے کیوں جائز نہیں سمجھتے (یعنی جن اصول سے آپ امام اور حاکم وقت کے لئے تقیہ کو جائز کہتے ہیں انہیں اصول کے مطابق رسولؐ کے لئے بھی جائز ہوسکتا ہے آپ اس سے کیوں انکار کرتے ہیں)۔

اگر آپ یہ جواب دیں کہ رسول اللہ کے لئے تقیہ اس وجہ سے جائز نہیں کہ ان کا قول حجت ہوتا ہے برخلاف امام و حاکم وقت' کہ ان دونوں کا قول حجت نہیں ہوتا ہے تو پھر ہم کہیں گے کہ جب رسولؐ کا تقیہ کرنا کسی شخص کو حق تک پہنچنے سے نہیں روکتا ہے اور نہ حکم خدا جاننے کی راہ میں کوئی خلل پیدا کرتا ہے تو ان کا قول حجۃ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے تقیہ ناجائز کیوں ہو جائے گا (یعنی یہ درست ہے کہ نبی کا قول حجۃ ہوتا ہے لیکن اگر صورت حال ایسی ہوگئی ہو کہ وہ تقیہ کریں جب بھی اصل حکم خدا لوگوں کو معلوم ہی رہیگا تو پھر کس دلیل

سے ان کے لئے تقیہ ناجائز کر دیا جائیگا)

اس کو اور واضح اس طرح سمجھئے کہ مذہب اسلام کی حدیثیں جو ہم کو مسلمان راویوں کے ذریعہ سے پہنچتی ہیں ہمارے مذہبی احکام کے لئے حجت ہیں۔ اب اگر کوئی ظالم زبردست شخص ان راویوں کو گرفتار کر کے ان کا مذہب دریافت کرے اور ان راویوں کو معلوم ہو کہ اگر وہ اپنا اصلی مذہب بتا دینگے تو وہ ظالم ان کو ضرور قتل کر دیگا یا ان کا مال لوٹ کر انہیں برباد کر دیگا تو ان راویوں کے لئے تقیہ جائز ہوگا یا نہیں۔ حالانکہ مذہب اسلام کی حدیثیں معلوم ہونے کا تنہا ذریعہ وہی راوی ہیں جسکی وجہ سے ان کا قول ہمارے لئے شرعی حجت ہے۔

پس اگر آپ اس جماعت کے لئے بھی تقیہ کو ناجائز کہیے تو جو اعتراض آپ ہم پر کرتے تھے وہ خود دفع ہو جائیگا اور اگر کہیے کہ ان مسلمان راویوں کے لئے تقیہ جائز ہے تو ہم پوچھیں گے کہ پھر (راویوں کی) اس جماعت میں اور ان میں جنکی تعداد اس جماعت سے کم ہے عدد کم ہونے سے کیا فرق ہے۔ کیونکہ ہم کو تو کوئی فرق معلوم ہی نہیں ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ جن لوگوں کا تم نے ذکر کیا ہے ان کے لئے ہم تقیہ کو اس لئے جائز کہتے ہیں کہ ان پر زبردستی کی گئی اور وہ مجبور کر دیئے گئے اور ان کی مجبوری و بے کسی ظاہر ہے اور اسی بے اختیاری میں ان کو تقیہ کرنا پڑا۔ اور تم لوگوں کو تقیہ کرنے سے اس وجہ سے منع کرتے ہیں کہ تم لوگ ایسے تقیہ کا دعوی کرتے ہو جس کی مجبوری واضح نہیں ہوتی نہ اس کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں تو اب ہم کہیں گے کہ اس طرح تو آپ نے ہم شیعوں کو دعوی تسلیم کر لیا جو کہتے ہیں کہ جب انسان مجبور ہو جائے کہ اس پر زبردستی کیجائے یا جان کا خوف ہو تو وہ تقیہ کرے۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ جنکی مجبوری ظاہر ہو ان کے لئے تقیہ جائز ہے۔ اب صرف یہ بحث باقی رہی کہ

امام جو تقیہ کرتے تھے تو ان کی مجبوری کے اسباب بھی ظاہر ہوتے تھے یا نہیں۔
مگر ہم کسی جگہ یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ امام نے کبھی ایسا بھی تقیہ کیا ہے جہاں اس کے لئے مجبور نہ ہو گئے ہوں اور آپ کی مجبوری اور بے بسی ظاہر نہ ہو گئی ہو اور جن بزرگ کے تقیہ کرنے کی وجہ ہمیں مفصل طور پر معلوم ہوں ان کا حکم علیحدہ ہے۔ ان کے تقیہ کرنے سے جسکی وجہ ہمیں مفصل طور پر واضح نہ ہوں اور جن اسباب کی وجہ سے کسی کو تقیہ کرنا پڑتا ہے ان کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کے لئے ظاہر بھی ہوں اور سب لوگ ان اسباب کو واضح طور پر جان لیں بلکہ اکثر اوقات تقیہ کے بارے میں حالت مختلف ہوتی تھی لیکن بہر صورت اتنا ضروری ہے کہ جس شخص کو تقیہ واجب ہوا ہے اس کو اسکی وجھوں اور مجبوریوں کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اس کے سوا لوگوں کو وہ مجبوریاں خواہ معلوم ہوں خواہ تجویز کرلی جائیں۔

اسی وجہ سے ہم بعض بادشاہوں حاکموں یا مالکوں کو دیکھتے ہیں کہ اپنی رعایا سے کسی واقعی بات کو پوچھتے ہیں تو بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں یہ بات اس طرح ہوئی ہے اور کچھ لوگ اس سے انکار کردیتے اس کو چھپاتے اور اسمیں توریہ کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو جو رعایا اس بات کو ظاہر کردیتی ہے اس کو اس کے ظاہر کردینے سے کوئی خوف نہیں ہوتا اور جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں ان کو خوف ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ وغیرہ کو معلوم ہو جائیگی تو میری سزا کرے گا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تقیہ کے وقت سب کا حال برابر ہو اور ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی نے اس وجہ سے تقیہ کیا ہے تا کہ اس کی طرف اشارہ تفصیلی طور پر واقع ہو بلکہ اس کی وجہ کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی پوشیدہ رہتی ہے۔

تیسرا اعتراض

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو قُم فَاَنذِر یعنی اے رسولؐ اٹھو اور لوگوں کو عذاب خدا سے ڈراؤ (پارہ ۲۹ ع ۱۵) کا حکم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ایک ہی دفعہ لوگوں کو ڈرایا اور اسلام کی طرف دعوت دی؟ پھر کافروں کی عداوت اور ظلم کو دیکھ کر حضرت خاموش ہو گئے۔ یہاں تک کہ آخر زمانہ میں حضرتؐ پر آیہ: يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (یعنی اے رسول جو کچھ حکم تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اس کو لوگوں تک ضرور پہنچا دو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کا کوئی پیغام تم نے پہنچایا ہی نہیں اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ پ ۶ ع ۱۴) نازل ہوئی تب آپ نے پھر لوگوں تک احکام خدا پہنچائے؟ یا ایسا نہیں (بلکہ حضرت برابر لوگوں کو ڈراتے ہی رہے اور کافروں کی مخالفت اور ظلم کی پروا نہیں کی)۔ اگر دوسری صورت صحیح ہے تو بتایئے آپ کس دلیل سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تقیہ کو واجب کہتے ہیں (اس لئے کہ آنحضرتؐ نے پہلی دفعہ قُم فَاَنذِر کی تعمیل میں لوگوں کو ڈرایا تو اسی وقت سے کافروں کا ظلم شروع ہو گیا جس کی وجہ سے خوف زدہ ہو کر حضرتؐ کو تقیہ کر لینا اور خاموش ہو جانا چاہیے تھا مگر حضرت ان کے ڈر سے کبھی خاموش نہیں ہوئے جس سے ثابت ہوا کہ کافروں کا ڈر ہو جب بھی اصلی احکام خدا کو پہنچاتے رہنا چاہیے اور تقیہ کرنا جائز نہیں ہے)۔ اور اگر آپ پہلی صورت کو اختیار کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قُم فَاَنذِر کے نازل ہونے پر صرف ایک دفعہ لوگوں کو ڈرایا پھر ان کافروں کے خوف سے چپ ہو گئے یہاں تک کہ حضرت کی آخری عمر میں آیہ بلّغ نازل ہوئی۔ اس وقت پھر حکم

خدا پہنچایا تو اس میں دو خرابیاں پیدا ہوتی تھیں ایک یہ کہ تواتر کی مخالفت لازم آتی ہے یعنی آیہ قُمْ فَاَنْذِرْ کے بہت دنوں (کم از کم ۱۸ سال) بعد آیت بلغ نازل ہوا (اس طرح کہ پہلی آیت بمقام مکہ آنحضرتؐ کی بعثت کے شروع ہی میں نازل ہوئی اور دوسری آیت سنہ ۱۰ھ میں بمقام مدینہ نازل ہوئی) اور یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ اس درمیان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر احکام مذکور کو لوگوں تک پہنچاتے اور دین اسلام کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے اور باوجودے کہ حضرت پر ہر طرح کا ظلم وعدوان کیا گیا۔ آپ کو مختلف صورتوں سے اذیت پہنچائی گئی مگر کبھی حضرتؐ نے اپنے فرض سے منہ نہیں موڑا۔ کافروں کا مذہب زبان سے جاری کرنا کیسا حضرتؐ نے کبھی ان کی خاطر سے تبلیغ اسلام میں کوتاہی تک نہیں کی۔ یہاں تک کہ اخلاص پسند لوگوں نے حضرتؐ کے مجموعی حالات اور زبردست معجزوں کو دیکھ کر حضرتؐ کا دین قبول کر لیا۔ اور حضرتؐ کے وفادار اور جاں نثار دوست بن گئے۔ پس اگر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی موقع پر سکوت کر جاتے اور کافروں کے خوف سے تقیہ کر کے ان کی موافقت ظاہر کر دیتے تو اس قدر اعوان وانصار کہاں سے پیدا ہو جاتے۔

دوسری خرابی یہ کہ خدا نے جو آنحضرتؐ سے فرمایا تھا کہ "اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا" تو یہ حفاظت کا وعدہ حضرات آئمہ کے لئے بھی تھا یا نہیں (یعنی خدا نے ان حضرات کو بھی لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو پھر ان حضرات نے حق کو باطل سے کیوں مخلوط کر دیا اور گمراہوں کا مذہب بعض وقت کیوں اختیار کیا۔ اور اگر وعدہ نہیں تھا تو شیعہ پھر کس وجہ سے کہتے ہیں کہ جو سبب خدا کے لئے نبی مقرر کرنے کا تھا وہی سبب اماموں اور خلفاء کے مقرر کرنے کا بھی تھا یعنی جس وجہ سے خدا پر واجب ہے

کہ لوگوں کی ہدایت جاری کرنے کے لئے خود رسول کو مقرر کرے اسی طرح خدا پر یہ بھی واجب ہے کہ لوگوں کو ہدایت پر باقی رکھنے کے لئے وہی امام اور خلیفہ بھی مقرر کرے)

جواب

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو ڈراتے اور احکام خدا کی طرف بلاتے اور احکام شرعیہ وعقائد دینیہ کی تبلیغ فرماتے رہے۔ ہاں جائز ہے کہ بعض اوقات میں وقتی مصالح سے مجبور ہو کر حضرتؐ نے تقیہ بھی فرما لیا ہو [۱] اور شیعوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ ہر حال میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقیہ واجب تھا جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ معترض صاحب نے دوسری خرابی جو ذکر کی ہے اس کی کیا مناسبت تھی کیونکہ جو وجہ خدا کے رسولؐ اور امام کو مقرر کرنے کی ہے تقیہ اس کے خلاف کیونکر ہے۔ اس لئے کہ جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کل احکام کو پہنچا دیا تو اب کسی وقت تقیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح امام نے بھی جب اسلامی احکام اور شرائع مذہب کو ظاہر کر دیا تو کسی

---

[۱] حضرات اہل سنت کے محدثین کے مطابق تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت افحش تقیہ کیا ہے۔ چنانچہ شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے لکھا ہے تلك الغرانيق العلى کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرتؐ کی زبان سے وہ الفاظ نکلوا دیئے جن میں بتوں کی تعریف ہے۔ بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابل اعتبار کہا تھا اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل بیان کی تھی لو وقع لارتد كثير ممن اسلم ولم ينقل ذلك یعنی اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں وجميع ذلك لا يتمشى على القواعد فان الطرق اذا كثرت وتباينت مخارجها دل ذلك على ان لها اصلا یعنی تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے (فتح الباری جلد ۸ ص ۳۳۳ مطبوعہ مصر) (سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۵۱) یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے ان میں طبری۔ ابن ابی حاتم۔ ابن المنذر۔ ابن مردویہ۔ ابن اسحاق۔ موسیٰ بن عقبہ۔ ابو معشر شہرت عام رکھتے ہیں اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

مجبوری سے ان کے تقیہ کر لینے میں کیا خرابی ہوگی (حالانکہ خدا نے اپنے قرآن مجید میں اس کی اجازت عام طور پر دی ہے۔ کسی شخص کی خصوصیت نہیں ہے چنانچہ اس کے متعلق یہ آیتیں شروع کتاب میں نقل ہو چکی ہیں ان میں کہیں یہ نہیں ہے کہ نبی اور امام ان احکام سے مستثنےٰ ہیں) ۱۲

چوتھا اعتراض

جس صورت میں آپ کفار سے تولی (دوستی) کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ تقیہ کر کے ان کے موافق مذہبی بات کہہ دیجائے اس صورت میں خاص کر حضرات ائمہ کے بارے میں ہم پوچھتے ہیں کہ جب بقول آپ لوگوں (شیعوں) کے شروع اسلام میں مدعیان اسلام کی ایک بڑی جماعت نے اپنے شیطانی خیالات کی بناء پر ارتداد اور کفر سے ملا ہوا نیا مذہب تراشا اور اس کو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۱)

حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے اس روایت کی صحت پر اصرار ہے چنانچہ لکھتے ہیں وقد ذکرنا ان ثلاثة اسانيد منها على شرط الصحيح وهي مراسيل يحتج بمثلها من يحتج بالمراسيل یعنی ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں) سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۱۷۶) اس سے واضح تر ثبوت آنحضرت صلعم کے تقیہ کا کیا ہو سکتا ہے مگر اب حضرات اہل سنت کہتے ہیں کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں تقیہ کے متعلق حضرات اہل سنت جو تقریر کرتے ہیں اس سے سخت تر مصیبت یہاں پیش آئے گی اس طرح کہ جب ایک دفعہ شیطان کو اتنی قوت ہو گئی کہ آنحضرتؐ کی زبان پر اس نے بتوں کی تعریف جاری کرا دی تو حضرتؐ کے کسی قول کے متعلق کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے کہ واقعاً خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید کی سورہ توحید کے بارے میں بھی مخالف کہہ سکتا ہے کہ معاذ اللہ شیطان نے آنحضرتؐ کی زبان پر یہ سورہ جاری کرا دیا۔ آنحضرتؐ نے نماز کی جو ترکیبیں بتائیں اسکے متعلق بھی مخالف کہہ سکتا ہے کہ شیطان نے جاری کرا دیں پھر تو اسلام کے کسی رکن کا اعتبار نہیں۔ حالانکہ خدا نے صاف فرما دیا ہے وما ينطق عن الهوىٰ ان هو الا وحي يوحىٰ میرا رسولؐ اپنے دل سے کوئی بات نہیں کرتا ہے جو کہتا ہے وہ خدا کی وحی پر کہتا ہے (پ ۲۷ ع ۵) جب خدا اس اہتمام سے یہ فرمائے تو پھر کس شیطان کی مجال تھی کہ حضرتؐ کی زبان پر بتوں کی تعریف جاری کرا دیتا۔ ہاں اس کو تقیہ کہئے تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ تقیہ کی اجازت تو خود قرآن مجید میں دی ہے لہٰذا یہ آسان ہے کہ حضرتؐ نے تقیہ کر کے بتوں کی تعریف کر دی ہوتا کہ اس وقت ان مشرکین کے ظلم سے بچ جائیں اور بعد حسب دستور تبلیغ کرتے رہیں۔ ۱۲

رواج دیا تو بحکم الکفر ملۃ واحدۃ (کفر خواہ جس صورت میں ہو سب کا حکم ایک ہی طرح ہے) وہ سب مدعیان اسلام کافر ہو گئے اور ائمہ علیہم السلام اس مذہب کے ظالموں سے ڈر کر اور تقیہ کر کے اپنا مذہب بھی بظاہر انہیں کے موافق بیان کرتے اور مقابلہ کے وقت حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام ظاہر کرنا واجب سمجھتے اور تنہائی میں راہ حق کو اختیار کئے رہے اور اپنے خاص معتقدین کو بھی اسی کی تعلیم کرتے رہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ احتمال نہیں پیدا ہوتا کہ واقعاً وہی بڑی جماعت حق پر ہو اور شیعوں کی اس تھوڑی جماعت ہی نے جو تنہائی میں ائمہ کے پاس آتی تھی دوسرے گمراہ فرقوں مثل خوارج ' زیدیہ ' اسماعیلیہ ' مفاوضہ وغیرہ کی طرح شیطانی خیالات کی بناء پر نیا مذہب تراش لیا اور حضرات ائمہ تنہائی میں انہیں شیعوں کے حملہ اور ظلم کے خوف سے مذہبی باتیں ان کے موافق کہہ دیتے ہوں اور بڑے بڑے مجمعوں میں چونکہ ان کے حملہ اور ظلم سے امن ہوتا تھا اس وجہ سے سچی بات اور حق کلام ظاہر فرما دیتے ہوں۔

مثلاً جناب امیر علیہ السلام نے خلیفہ ثانی کو ان کے زمانہ میں جو فرمایا کہ ان یکن الاخری کنت ردءً للناس ومثابۃ للمسلمین (یعنی اگر اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوگی تو تم لوگوں کی مدد اور مسلمانوں کی پناہ ہو گے) اور خلیفہ ثالث سے بھی برابر مخالفین کے حملوں کو رد کرتے تھے تو ہوسکتا ہے کہ حضرتؑ نے دل ہی سے ان خلفاء کی تائید کی اور ان کی خلافت کو حق سمجھا ہو (اور تنہائی میں اپنے شیعوں سے جو ان خلفاء کی مذمت کی تو اسی وقت ان شیعوں کے ڈر سے انہیں شیعوں سے تقیہ کر لیا ہو) اور خطبہ شقشقیہ میں کلمۃ فمنی الناس لعمر اللہ بخبط وشماس وتلون واعتراض (خلیفہ ثانی کی خلافت میں خدا کی قسم لوگ گمراہی۔ سرکشی۔ اختلاف اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے) حضرت

عمر کے متعلق اور قام ثالث نافجا حصنیہ بین نثیلہ (اور تیسرا اپنا پیٹ پھیلائے ہوئے متکبر اور مغرور ہو کر اپنی لید اور چارے کے درمیان اس خلافت کے لئے کھڑا ہو گیا) حضرت عثمان کے بارے میں جو فرمایا ہے یہی تقیہ سے فرمایا ہو۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ ہاں یہ احتمال ہو سکتا ہے تو معاذ اللہ حضرات ائمہ کا کل کلام پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتا ہے اور کسی پر اعتماد نہیں رہتا کہ کون بات حق فرمائی اور کون بطور تقیہ اور اگر کہیے کہ یہ احتمال پیدا نہیں ہو سکتا تو اس انکار کی وجہ بیان کیجئے۔ اگر آپ یہ کہیے کہ جب ائمہ سچے دل سے ان ظالموں (خلفاء جور وغیرہ) کے مذہب کو اختیار کرتے (یعنی بظاہر جو ان ظالموں کے مذہب کو صحیح کہتے تھے وہی ان کا دلی اعتقاد ہوتا تھا) تو لوگوں سے ان خلفاء کی شکایت کیوں کرتے۔ ان سے متاذی اور متنفر کیوں رہتے۔ ان کو ظالم اور گمراہ کیوں بتاتے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات ان ظالموں کے مذہب کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے اور حق نہیں جانتے تھے)۔ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ان خلفاء جور کی ایذاء صرف ریاست کی محبت اور دنیوی حسد کی وجہ سے تھی اور ہر زمانہ میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ کتنے لوگ باوجود ہم مذہب۔ ہم مسلک ہونے کے صرف حسد کی وجہ سے آپس میں کتنی دشمنی رکھتے ہیں۔ چنانچہ باوجود یہ کہ حضرات ائمہ اپنے ظالموں کے مذہب کی موافقت ظاہر کرنے اور مذہب حق چھپانے میں پورا مبالغہ کرتے تھے۔ پھر بھی وہ طرح طرح کی ایذا ان حضرات کو پہونچاتے تھے جس سے ہمارے ہی قول کی تائید ہوتی ہے۔

جواب

اگر معترض صاحب کا مطلب یہ ہے کہ شیعوں کے ہاں یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے تو یہ مہمل وہم ہے کیونکہ شیعوں کو یقین ہے کہ وہ انگ حضرات ائمہ علیہم

السلام کے پیرو۔ جان نثار اور غلام ہیں۔ اور یہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں ان سب کو وہ لوگ سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ حضرات ائمہ کے مذہب کے سوا دوسرا مذہب نہیں رکھتے پھر کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ائمہ ان سے تقیہ کر کے اپنا مذہب کچھ کا کچھ کہہ دیتے ہوں۔ (کیونکہ شیعوں کا جو اعتقاد اور عمل ہے وہ تو ائمہ کا بتایا ہوا ہے۔ پھر وہ کون سا مذہب ہے جس کے لئے ائمہ اپنے شیعوں سے تقیہ کرتے بر خلاف بادشاہان وقت کے کہ وہ اپنا مذہب حضرات ائمہ کی تعلیم سے نہیں اختیار کرتے تھے لہذا وہاں حضرات ائمہ تقیہ کر سکتے تھے) اور تقیہ کا مدار تو خوف اور ضرر ہے کہ جس سے ظلم یا نقصان کا ڈر ہو اس سے تقیہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ خوف اور ضرر دشمنوں اور مخالفوں سے ہوتا ہے۔ پیروؤں۔ دوستوں۔ جان نثاروں سے نہ خوف ہوتا ہے نہ ضرر۔ لہذا شیعوں سے حضرات ائمہ کسی طرح تقیہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اور اگر یہ مطلب ہے کہ سنیوں کے ہاں یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے تو اس سے ہمارا کیا نقصان ہے۔ باوجود اس کے چونکہ اہل سنت ائمہ کے لئے تقیہ کو جائز نہیں سمجھتے تو وہ کیونکر اس بات کو جائز رکھیں گے کہ کہیں حضرات ائمہ مخصوص شیعوں کو ان سے تقیہ کر کے مذہب اہل سنت کے خلاف فتوے دیتے تھے (جب آپ کے اعتقاد کے مطابق ائمہ کے لئے کسی حالت میں کسی سے تقیہ کرنا جائز ہی نہیں تو وہ شیعوں سے تقیہ کر کے مذہب اہل سنت کے خلاف فتوے کس طرح دے سکتے تھے غرض شیعوں سے بھی جو کہتے ہوں گے مذہب حق ہی کہتے ہوں گے)

اور جناب علم الہدیٰ سید مرتضی علیہ الرحمہ نے کتاب شافی میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی صاحب کہیں کہ جب امام کے لئے تقیہ جائز مانا جائیگا تو ان حضرات کا اصل مذہب اور دلی اعتقاد کس طرح معلوم ہو سکتا ہے اور ہمیں کیونکر پتا چلے گا

کہ ان کا فلاں فتویٰ تقیہ کی راہ سے ہے اور فلاں فتویٰ ان کا اصلی مذہب اور دلی اعتقاد ہے۔

تو ہم ان سے کہیں گے کہ پہلے ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جن باتوں کا علم امام کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکتا ان باتوں میں امام کو تقیہ کرنا جائز ہی نہیں ہے بلکہ ان کو تقیہ اسی وقت جائز ہے جب حق باتوں کا علم دلائل و براہین سے پہلے ہو چکا ہو اور اس کے ہونے کے ذریعہ واضح ہو گئے ہوں تاکہ تقیہ والا فتویٰ مذہب حق پر پردہ ڈال سکے۔ پھر امام اسی چیز میں تقیہ کریں گے جس سے نکلنے کی راہ بھی بتا دیں گے خواہ اسی وقت اشارہ کنایہ سے کوئی بات کہہ کر۔ خواہ اس کے پہلے اصلی مذہب کو بتا کر خواہ بعد میں اس کی حقیقت ظاہر کر کے۔ اور جو شخص ان تمام مقامات کی تحقیقات کرے جنمیں حضرات ائمہ نے تقیہ کیا ہے اس کو آسانی سے معلوم ہوگا کہ ان حضرات کا تقیہ ویسا ہی ہوتا تھا جیسا ہم نے بیان کیا (کہ ان حضراتؑ نے تقیہ سے جو بات فرمائی اس کے متعلق اصلی مذہب کو اشارہ کنایہ میں اسی وقت یا صاف صاف پہلے یا بعد ضرور بتا دیا ہے)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تقیہ جب ہوتا ہے تو دشمن ہی سے۔ دوست سے نہیں۔ اور نا قابل اطمینان ہی لوگوں سے۔ معتبر لوگوں سے نہیں۔

پس حضرات ائمہ نے جو باتیں امن و امان کی جگہوں میں جہاں کوئی خوف نہیں تھا اپنے شیعوں، دوستوں اور خیر خواہوں سے فرمائیں ان سب کے بارے میں اطمینان ہے کہ تقیہ سے نہیں کہیں بلکہ اپنے واقعی خیالات اور حق مذہب کو بتایا جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں جو باتیں ان حضرات نے اپنے دشمنوں سے کیں یا جو فتوے ان حضرات سے خطرناک موقعوں پر

حاصل کئے گئے جن سے درحقیقت ان حضرات کا امتحان مقصود تھا وہاں ان حضرات نے جو کچھ فرمایا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تقیہ سے ہو۔

اب اسی اعتراض کو الٹ کر ہم خود معترض صاحب پر وارد کرتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ جب عام لوگوں کے لئے خوف کے وقت آپ تقیہ کو جائز سمجھتے ہیں تو کون شخص ان تمام لوگوں کے اصلی مذہب اور اعتقاد کو سمجھ سکتا ہے اور کیونکر اس کا فیصلہ ہوگا کہ مفتی نے کون سا فتویٰ تقیہ سے دیا ہے اور کون فتویٰ واقعاً اپنے اصلی مذہب کے مطابق دیا ہے۔

بہر طور معترض کو بھی اس کے جواب میں وہی بات اختیار کرنی ہوگی جو ہم اوپر بیان کر چکے (کہ خوف کی حالت کے فتوے میں تقیہ کا احتمال ہوگا اور اطمینان کے فتویٰ میں یہ احتمال نہیں ہوگا) اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ اگرچہ ہم نے دوسروں کے لئے تقیہ کو جائز کہا ہے مگر ہم ان کے اصلی مذہب کو اس طرح سمجھ جائیں گے کہ دیکھیں گے وہ ہم کو اس کے ماننے کے لئے زور دیتے ہیں یا نہیں۔ اگر زور دینگے تو وہی ان کا اصلی مذہب ہے اور نہیں زور دینگے تو سمجھیں گے کہ یہ تقیہ ہے۔ تو ان صاحب سے ہم کہیں گے کہ پھر حضرات ائمہؑ کے بارے میں ایسا کیوں نہیں قبول کرتے (کہ جن عقائد کو ماننے کے لئے ان حضرات نے زور دیا وہی ان کے اصلی عقائد تھے اور جن عقائد کے لئے ایسا نہیں کیا ان میں تقیہ کا احتمال ہوسکتا ہے)۔

پانچواں اعتراض

کتاب شرح مفاتیح کے باب الفرائض فصل سوم میں اس عبارت: ان کان واحدافی ای طبقة اور درجة یحوز المال (اگر میت کا وارث ایک ہی ہو خواہ وہ کسی طبقہ یا درجہ کا ہو وہ سب مال لے لیگا) کی تشریح کرتے ہوئے

لکھا ہے :- قال سلمة ابن محرز قلت لابی عبداللہ ان رجلا مات و اوصیٰ الی بترکته و ترك ابنته قال اعطھا النصف قال فاخبرت زرارة بذلك فقال لی اتقاك انما المال لها فدخلت علیه بعد فقلت اصلحك الله ان اصحابنا زعموا انك اتقیتنی. فقال لا واللہ ما اتقیتك لکنی اتقیت علیك ان تضمن فهل علم بذلك احد فقلت لا فقال اعطها مابقی یعنی سلمہ بن محرز کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی کہ ایک شخص مرگیا اور اس نے اپنے ترکہ کی وصیت مجھ سے کی ہے اور وارثوں میں اپنی ایک بیٹی چھوڑی ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا اس لڑکی کو ترکہ کا آدھا دیدے۔ اس کے بعد میں نے حضرتؑ ہی کے مشہور صحابی جناب زرارہ علیہ الرحمہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضرتؑ نے تم سے تقیہ کیا ہے۔ حقیقت میں پورا مال اسی لڑکی کا ہے۔ تب میں پھر حضرتؑ کے پاس گیا اور عرض کی کہ خدا حضور کو خوش رکھے حضور کے اصحاب کہتے ہیں کہ حضور نے مجھے جو فتویٰ دیا اس میں مجھ سے تقیہ کیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا نہیں خدا کی قسم میں نے تم سے تقیہ نہیں کیا بلکہ تمہارے بارے میں ڈرا کہ تم کو اس مال کا تاوان نہ دینا پڑے۔ اچھا اور کسی کو بھی اس کی خبر ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کی نہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا اس لڑکی کو باقی ترکہ دے دو۔ فقط

یہ روایت اور ایسی ہی اور روایتیں صحیح ہیں یا نہیں۔ اگر صحیح ہیں تو مجھے کچھ کہنا نہیں (مگر آپ کی کتابیں ایسی ہی ہیں جن میں غلط روایتیں بھری ہیں) اور اگر صحیح ہیں تو یہ عقلی احتمال جس کے دونوں پہلو برابر ہیں پیدا ہوتا ہے یا نہیں کہ بعض مسائل جن کا فتویٰ حضرات ائمہ نے اپنے مخصوص شیعوں اور رازداروں کو مذہب اہل سنت کے موافق دیا ہے ہوسکتا ہے کہ اپنے شیعوں کو

نقصان سے بچانے کے لئے وہ فتوے دیئے ہوں اور حضرات ائمہ کا اصلی مذہب کل جزئی مسئلوں میں مذہب اہل سنت کے خلاف ہی ہو۔

اگر آپ اس احتمال کو تسلیم کرتے ہیں تو شیعوں کا خاص مذہب (جو مذہب اہل سنت سے علیحدہ ہے) باطل ہوتا ہے۔ اور اگر اس احتمال کو نہیں تسلیم کرتے ہیں تو فرمایئے کس وجہ سے آپ اس احتمال سے انکار کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ اس احتمال کے ماننے سے امام کے مقرر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی تو ہم کہیں گے کہ یہ تو اس احتمال کے روکنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس مصلحت سے باقی اماموں کا وجود بھی ضروری مان لیا جائے۔ اگرچہ ہم لوگوں کو ان کے مذہب کا پتا چلنا مشکل ہو۔

جواب

اس احتمال کے پیدا بلکہ ممکن نہ ہونے کی یہی زبردست دلیل کافی ہے کہ حضرات ائمہ علیہم السلام کا قاعدہ شروع سے یہ رہا ہے کہ پہلے مذہب حق کی ہر بات کو اصلی صورت میں حق کے مطابق بیان فرما دیتے تھے اس کے بعد کسی خاص موقع پر خلفاء جور کی مخالفت کے خوف سے مجبور ہو کر مذہب اہل سنت کے مطابق بھی فتوے دے دینا جائز سمجھتے تھے تاکہ قتل اور خونریزی کا بازار نہ گرم ہونے پائے۔ چنانچہ حضرت مولانا میر باقر داماد علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ تقیہ کے اصول کو مختصر طور پر اس طرح سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ائمہ سے کسی خوف کی حالت میں یا کسی مصلحت کی مجبوری سے جو باتیں تقیہ یا توریہ کے طور پر ظاہر ہوئی ہیں وہ سب اسی وقت ہوئی ہیں جب اس سے پہلے ان حضرات نے خدا کے مخلص بندوں اور ایمان دار لوگوں سے ان باتوں کو صحیح طور پر خوب واضح کر کے اور مذہب حق کو صاف صاف بیان کر دیا تھا (یعنی اصلی حکم خدا و

رسول جس مسئلہ میں جو ہوتا تھا اس کو پہلے اچھی طرح بیان فرما دیتے جس سے لوگوں کو پورا علم ہوجاتا تھا اور مذہب حق پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔ اس کے بعد جب کوئی مجبوری پیش آجاتی تھی تو صرف اسی موقع پر محض مخالفین کے ظلم سے بچنے یا دوسروں کو بچانے کے لئے تقیہ کرکے ان کے موافق بات بھی ظاہر فرما دیتے تھے) جس میں کوئی خرابی نہیں اور نہ کسی قسم کا اعتراض ہوسکتا ہے۔

چھٹا اعتراض

کافروں سے تقیہ کرنے کا مدار انہیں دو باتوں سے کسی ایک پر ہے یا کوئی تیسری صورت بھی ہوسکتی ہے۔ اول یہ کہ نقصان اور اذیت پہنچنے کے جو اسباب جمع ہوگئے ہیں ان سب کو اس طرح ہٹا دیا جائے کہ قوی امید ہو اب اس نقصان اور اذیت سے نجات رہے گی۔ اگرچہ زبردستی یا مجبوری کی نوبت نہ آئے (یعنی اس وقت ایسا حالت نہ ہو کہ انسان کو مجبور ہوکر ضرور ہی تقیہ کرنا پڑے۔ ہاں ایسی حالت ہو کے تقیہ کرنے سے نقصان کے ہٹ جانے کی قوی امید پیدا ہوجائے) دوسری یہ کہ ایسی مجبوری ہوجائے کہ سوا تقیہ کے اس ظلم سے بچنے کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہے۔ پہلی صورت میں کافروں سے ایسی دوستی کرکے جو سورہ ممتحنہ میں ذکر کی گئی ہے (کہ ان سے بھلائی اور انصاف کیا جائے) تقیہ کرنا جائز ہے اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے دوستی کرکے جو ہمارے آپکے درمیان محل نزاع ہے یعنی ان کا مذہب قبول کرکے تقیہ کرنا بھی جائز ہو تو اس صورت میں ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کی ان صاف آیتوں: لاتخافوهم و خافون ان کنتم مومنین ۔ ولا تخشوهم واخشون وایای فارهبون وامثالها ۔ یا ایها الذین آمنو کونو قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم الایته وامثال ذلک (یعنی

تم لوگ ان کافروں سے نہ ڈرو بلکہ ہم ہی سے ڈرتے رہو بشرطیکہ تم مومنین سے ہو اور تم لوگ ان سے نہ خوف کرو ہم ہی سے خوف کرتے اور ہمارے غضب ہی سے بچتے رہو اور ہمارے عذاب ہی سے سہمے رہا کرو۔ اور اے ایمان والو انصاف پر مستقل طور سے قائم رہو اور اللہ کے لئے گواہ بنے رہو اگرچہ تمہیں اس سے نقصان ہی اٹھانا ہو (پ ۴ ع ۹۔ پ ۶ ع ۵۔ پ ۱۴ ع ۱۳۔ پ ۵ ع ۱۷) کا کیا مطلب ہوگا اور یہ سب احکام کن وقتوں کے لئے ہیں۔

اور دوسری صورت میں ہم کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہے یا نبیؑ اور امامؑ کے لئے بھی۔ پہلی شق پر (کہ یہ تقیہ شرف مسلمانوں ہی کے لئے ہو) جائز ہے یا واجب۔ اگر جائز ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ آیہ اکراہ کا مطلب یہی ہے اور جناب عمار کے تقیہ کا قصہ اس کا گواہ بھی ہے لیکن اگر تقیہ کو آپ مسلمانوں کے لئے واجب کہتے ہیں تو واجب ہونے کی دلیل پیش کیجئے اور یہ بھی فرمایئے کہ آیۃ: لا یخشون احدا الا اللہ ولا یخافون لومۃ لائم وامثالھا (یعنی وہ لوگ اللہ کے سوا کسی سے بھی نہیں خوف کرتے اور کسی ملامۃ کرنے والے کی برائی سے ذرہ برابر بھی نہیں ڈرتے ہیں) اور اسی مضمون کی دوسری آیتیں کسی کی مدح میں ہیں۔ اور حضرت خاتم آل عباء ریحانہ سید انبیاء سیدی ومولائی جناب سید الشھداءؑ کے واقعہ کی کیا تاویل ہے کیونکہ یہ بات تو تواتر سے ثابت ہے کہ حضرتؑ پر کربلا میں ناجائز بیعت کے لئے پورا زور دیا گیا اور ہر طرح آپ مجبور کئے گئے مگر نہیں کیا۔ جان دیدی اور بیعت نہیں کی۔ اور دوسری شق پر (تقیہ نبی اور امام کے لئے بھی ہے) ان اعتراضات کا جواب عنایت فرمائیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا یعنی کیا وہ لوگ اس طرح مجبور کردیئے گئے کہ ان پر واجب ہو کہ ان کافروں کا مذہب نظام قبول

کرلیں اور کافروں کی مخالفت کے وقت ان کے ڈر سے اللہ پر افتراء کرنا نبی اور امام کے لئے بھی جائز ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ حضرات جس غرض کے لئے نبی یا خلیفہ مقرر کئے گئے ان کے لئے ایسا تقیہ کرنا بدیہی طور پر اس غرض کے خلاف ہے (کیونکہ وہ تو اسی لئے مقرر کئے گئے کہ کافروں کی مخالفت کر کے ان کے مذہب کو باطل کہیں اور اپنے مذہب کو پھیلائیں) درایت (عقل) بھی انبیاء وائمہ کے لئے ایسے تقیہ کو ناجائز کہتی ہے اور روایت بھی۔

اور ان حضرات کا ایسا تقیہ تواتر کے خلاف بھی ہے اس لئے کہ حضرت نوحؑ نے باوجودیکہ آپکی قوم آپ پر ہر طرح کا ظلم واذیت کرتی رہی اور ہزار برس تک آپ ہر روز سنگسار ہوتے رہے اور حضرت ابراہیمؑ نے باوجود نمرود کی اس درجہ سرکشی اور بدمعاشی کے اور حضرت موسیٰ وہارون نے باوجود فرعون اور فرعونیوں کے طغیان اور عداوت کے اور حضرت خاتم النبیینؐ نے باوجودے کہ خود تنہا تھے اور تمام مکہ والے حضرت کے دشمن ہو گئے تھے اور جوار کے کل سرداران عرب بھی آپ کے خلاف ہو رہے تھے اور حضرتؐ کے چھپے ہوئے دشمن بھی آپ کو ستا رہے تھے جیسے حضرت ابوبکر جو غار میں اسی غرض سے روئے تھے کہ حضرت کو گرفتار کرادیں اور حضرت عمر جو ہمیشہ آنحضرتؐ پر اعتراض ہی کرتے رہتے اور آپ کو اذیت ہی پہنچاتے رہتے تھے اور وہ خود بھی اپنے نفاق کا اقرار کرتے تھے اور حذیفہ بن یمان بھی انکے منافق ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ غرض ان حضرات انبیاء نے اس قدر ظلم ومخالفت برداشت کرنے پر بھی ایسا تقیہ نہیں کیا کہ کافروں کا مذہب بظاہر قبول کرلیا ہو۔ اور ان کے ڈر سے اللہ پر افتراء باندھنے لگے ہوں۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا اپنی زوجہ کو جو آپکی مذہبی بہن ہونے میں اس وقت منفرد تھیں اور حضرتؑ کی چچازاد بہن بھی تھیں ایسے شخص سے

جس کے مقابلہ میں حضرتؑ کو تلوار چلانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ بہن کہنا تو جحت ہے (حالانکہ اس وقت کوئی ایسا لفظ بھی مقرر نہیں ہوا تھا جس سے زوجیت کا تعلق بغیر کسی شبہ کے ظاہر کیا جا سکتا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس وقت جناب ابراہیمؑ کے بارے میں خدا کا کوئی خاص حکم نازل ہوا ہو) اور اس کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کی وہ حرکتیں جنکی وجہ سے حضرت آگ میں ڈالے گئے حجت نہ ہوں اور مومن آل فرعون کا فعل تو حجت ہو جسکی صفت قرآن مجید میں یہ ہے کہ اپنا ایمان چھپاتا تھا۔ حالانکہ اس وقت حضرت موسیٰ کی شریعت میں ایسے احکام صادر نہیں ہوئے تھے جن کی بجا آوری سے کسی شخص کا مذہب بغیر تکلف کے ظاہر ہو سکتا۔ اور اس صورت میں کسی ایسے شخص کا جو فرعون کے دربار میں حاضر نہیں ہوا ہو ایمان چھپانا بظاہر اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا کام ضرور کرے جو مذہبی طور پر منع کیا گیا ہو مگر اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کا فعل حجت نہ ہو جو فرعون ایسے ظالم اور بے رحم دشمن کے مقابلہ میں تھا جس کے ظلم کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ضرب چہار میخہ اسی کی ایجاد ہے اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دب کر اور کفار کی باتوں کو مان کر حدیبیہ میں صلح کر لینا جو حکم خدا ان جنحوا للسلم فاجنح لھا (اگر وہ لوگ صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی جھک جائیں) کے مطابق تھا الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (سوا اس کے جو مجبور کر دیا جائے مگر اس کے دل میں ایمان بھرا ہو) کے مطابق نہیں تھا اور جو وضع ہو چکی تھی اس کے مطابق حضرت عمر کا اس صلح پر اعتراض کرنا اس قول سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو آپ ہی نے اسیران بدر کے بارے میں فرمایا تھا یا ملائکہ نے خدا سے انی جاعل فی الارض خلیفۃ (میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں) کے جواب میں کہا تھا کہ جسکی مناسب تاویل نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں قرآن مجید

میں یہ بھی ہے ویجادلنا فی قوم لوط (یعنی ابراہیم ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے پ ۱۲ ع ۷) اور قد سمع اللہ قول التی تجادلك (یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تم سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ پ ۲۸ ع ۱) بھی قرآن مجید میں موجود ہے (پس جس طرح ملائکہ کا خدا کو جواب دینا یا حضرت ابراہیمؑ کا خدا سے جھگڑا کرنا قابل اعتراض ہے) اور غار میں حضرت رسولؐ خدا کا چھپنا جحت ہو مگر وہ امر جحت نہ ہو جس پر حضرتؐ کو مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور جو غار تک پہنچنے کی علت تھی اور آنحضرتؐ کی پسندیدہ خصلت کہ نبوت کے شروع میں بزمانہ حج اہل جاہلیت منا کے بازار اور مکہ کی گلیوں میں اشاعت اسلام کی غرض سے پھرتے تھے مگر کوئی بھی اپنے یا پرائے سے حضرتؐ کی خبر نہ لے سکا۔ اور جناب امیر علیہ السلام تو صرف دس بارہ سال کے تھے۔ البتہ صرف بیچارے حضرت ابوبکر نے جنہوں نے آئندہ منافع کے لالچ میں منجموں کے قول پر اعتماد اور منافقانہ روش اختیار کر کے خود سے آنحضرتؐ کے ضروری مصارف کا سامان کر دیا اور اس وقت سے آج تک ممدوح کے سر سے سب و شتم موقوف نہیں ہوا۔ منافقانہ طور پر حضرتؐ کا ساتھ دیا اور اسلام بلند کرنے کی کوشش کی۔ پس یہ سب باتیں جحت نہ ہوں) یہ کیسا انصاف ہے۔

اور جب کفار حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہوئے اس وقت جناب امیر علیہ السلام کا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرش پر سونا تو اس کی دلیل نہ ہو کہ تقیہ واجب نہیں ہے مگر انہیں جناب امیرؑ کا اپنی لڑکی کو ایسے شخص کے نکاح میں دینا جنکی عمر آپ لوگوں کے گمان کے مطابق کفر میں گذری اور جنہوں نے درمیان میں منجموں کے قول پر اعتماد کر کے نفاق کی روش اختیار کی اور پھر دوبارہ کافر ہو گئے۔ یہ تقیہ کے واجب ہونے کی دلیل ہو سبحانك هذا بهتان

عظیم (اے اللہ تیری ذات پاک ہے یقیناً یہ بڑا بہتان ہے) خصوصاً اس بزرگ پر جن کو آپ لوگ سوا حضرت رسولؐ خدا کے کل انبیاء اور اولوالعزم سے بھی افضل کہتے ہیں اور اگر اس تقیہ کا مدار کوئی تیسرا امر ہے تو اس سے مطلع فرمائیں۔ اس تقریر سے تقیہ کے بارے میں ہمارا مذہب معلوم ہو گیا۔

جواب

ان کل باتوں کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے طویل بیان کی ضرورت ہے جو بڑی کتابوں میں موجود ہے لیکن یہاں صرف مختصراً ایک ایک جملہ کا جواب علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اعتراض: آپ نے لکھا ہے "اس صورت میں ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کی ان صاف آیتوں لا تخافوھم"

جواب:۔ یہ آیتیں ان وقتوں کے لیے مخصوص ہیں جب مسلمانوں اور اہل حق کا غلبہ ہو لیکن جب کفر اور نفاق کا غلبہ ہو تو اس وقت کی حالت بہت سی دلیلوں کی وجہ سے ان آیات کے حکم سے مستثنیٰ ہے۔

اعتراض: آپ پوچھتے ہیں "پہلی شق پر تقیہ واجب ہے یا جائز"

جواب:۔ یہ ہے کہ بعض مقاموں پر واجب ہے اور بعض میں جائز۔

اعتراض: آپ فرماتے ہیں "واجب ہونے کی دلیل پیش کیجئے"۔

جواب:۔ واجب ہونے کی دلیل۔ ایک آیۃ یہ بھی ہے: لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ یعنی تم لوگ اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان نہ کرو[ا] اس کے علاوہ بہت سی حدیثیں بھی ہیں اور آیۃ لا یخشون الا اللہ وغیرہ مخصوص اس جگہ کے لئے ہے جہاں تقیہ نہ ہو اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے اعتراض کا جواب

[ا] اور امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے دفع الضرر عن النفس واجب قدر الامکان یعنی جب تک ممکن ہو اپنے نفس سے ضرر کا دفع کرنا ہر شخص پر واجب ہے (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۶۴۶)

کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ وغیرہ میں تفصیل سے مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شیعوں کا یہ اعتقاد ہی نہیں ہے کہ تقیہ ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں چاہئے بلکہ اسی وقت جب تقیہ کرنے سے کسی خاص شخص کی جان بچے اور دین اسلام کا نقصان نہ ہو۔ اسی وجہ سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام اسلام کے ظاہر کرنے کے قبل تقیہ نہیں کیا۔ امام حسین علیہ السلام بھی اگر تقیہ کر کے بیعت کر لیتے تو اسلام کا شدید نقصان ہوتا کیونکہ پھر اس کے اصلی احکام لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکتے۔ خدا کا سچا دین مٹ جاتا بلکہ کلمہ لا الہ الا اللہ کی بنیاد منہدم ہو جاتی۔

اعتراض:۔ آپ فرماتے ہیں "دوسری شق پر ان اعتراضات کا جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:۔ آپ کو معلوم ہو چکا کہ نبی امام پر تقیہ ہر وقت جائز نہیں ہے بلکہ صرف اسی حالت میں جب پہلے احکام اور شرائع کو واضح طور بیان فرما چکے ہوں۔ غرض مذہب کی جو باتیں دلائل و براہین سے ظاہر ہو چکی ہیں اور ان کے معلوم ہونے کے ذریعہ پیدا ہو چکے ہیں ان میں تقیہ جائز ہے اور اس صورت میں تقیہ ان انبیاء کی بعثت اور ائمہ کے تقرر کے خلاف نہیں ہوگا۔

اعتراض:۔ آپ لکھتے ہیں "حضرت نوح نے باوجودیکہ "

جواب:۔ بیان ہو چکا کہ شیعوں کا یہ اعتقاد ہی نہیں ہے کہ انبیاء کو ہر وقت تقیہ کرنا جائز ہے۔ اگر پیغمبر بھی تقیہ کرے تو احکام و شرائع خلق تک کیونکر پہنچیں گے اور اس کی بعثت کی غرض بے کار ہو جائیگی۔ ہاں جب احکام و شرائع اچھی طرح واضح ہو چکے ہوں اور لوگوں کو مذہب حق تک پہونچنا دشوار نہ ہو تب تقیہ جائز ہے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ اور دوسرے انبیاء کے مصائب سے تقیہ کے ناجائز ہونے پر استدلال کرنا عجیب بات ہے۔

اعتراض:۔ آپ نے فرمایا ہے حضرت ابراہیمؑ کا اپنی زوجہ کو بہن کہنا"۔

جواب:۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنی زوجہ کو بہن کہنا تقیہ کے لئے زبردست حجت کیوں نہیں ہے حالانکہ حضرات اہل سنت کی صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لفظ کو جناب ابراہیمؑ کی تین جھوٹ باتوں سے قرار دیا ہے اور نبی کو جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ جناب ابراہیم نے تقیہ کیا تھا اور حضرات ائمہ اپنے مخالفین کے زمانہ میں تلوار چلانے کے مجاز نہیں تھے اور صحیفہ الٰہیہ پر جو ہر امام کے لئے خاص ہوتا تھا عمل کرتے تھے۔

اعتراض:۔ آپ نے لکھا ہے "مومن آل فرعون کا فعل تو حجت ہو "

جواب:۔ خدا کا قول یکتم ایمانہ (وہ مومن آل فرعون اپنا ایمان چھپاتا تھا) صاف ثابت کرتا ہے کہ وہ شخص زبان سے کفر ظاہر کرتا اور ایمان کو دل میں چھپائے تھا چنانچہ قاضی بیضاوی نے اس آیہ کی تفسیر میں کہا ہے والرجل اسرائیلی او غریب موحد کان ینا فقھم یعنی وہ شخص اسرائیلی تھا یا ایک اللہ پر ایمان رکھنے والا مسافر تھا جو ان لوگوں سے منافقانہ برتاؤ کرتا تھا۔

اعتراض:۔ آپ فرماتے ہیں "اسکے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کا فعل حجت نہ ہو"

جواب:۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ خود علامہ اہل سنت قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کافروں کے ساتھ بطور تقیہ زندگی بسر کرتے تھے (تفسیر بیضاوی جلد ۲ ص ۱۰۴)

اعتراض:۔ آپ لکھتے ہیں کہ حضرت سیدالانبیاء کا حدیبیہ میں صلح کر لینا الخ"

جواب:۔ شیعہ یہ نہیں کہتے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقیہ کر کے صلح حدیبیہ کو اختیار کیا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے اس موقع پر اپنے نام سے جو

رسول اللہ کا لفظ محو کرایا اور مسلمانوں کو کافروں کے پاس واپس کردیا یہ تقیہ تھا اور بعض علماء اہل سنت نے بھی کہا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے پاس واپس کرنے کی شرط فاسد ہے مگر یہ کہ مسلمان ضعیف ہوں کہ اس صورت میں یہ شرط کر سکتے ہیں جیسا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا۔ علامہ ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے پاس واپس کرنے کی شرط فاسد ہے اور صلح کو فاسد کردیتی ہے مگر اس وقت یہ شرط ہو سکتی ہے۔ جب مسلمانوں میں سستی اور عاجزی ظاہر ہو اور اسی (مسلمانوں کے ضعف کی) وجہ سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں یہ شرط کی کہ مسلمانوں کو کافروں کے ہاں واپس کردیں گے (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۳ ص ۵۷۶) اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو کافروں کے پاس واپس کرنے کی شرط جو ناجائز ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے ضعف اور کافروں کے غلبہ کی وجہ سے مان لیا تھا اور یہی تقیہ ہے۔

اعتراض:۔ آپ نے فرمایا ہے "جو وضع قائم ہو چکی تھی" الخ

جواب:۔ صلح حدیبیہ میں حضرت عمر کا اعتراض اگر اسی مجادلہ کے مثل تھا تو اس وقت آپ یہ کیوں فرماتے تھے لقد ارتبت ارتیابا ما ارتبته منذ اسلمت الا یومئذ یعنی مجھے نبوت میں ایسا شک ہوا کہ جب سے مسلمان ہوا ہوں ایسا شک کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور کیوں اس کا کفارہ ادا کرتے رہے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے "میں نے اس بے ادبی کے کفارہ میں جو بروز حدیبیہ مجھ سے واقع ہوئی اکثر اعمال صالحہ مثل روزہ نماز وصدقہ کے ادا کئے" (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۵ وسیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶۸ وغیرہ)

اعتراض:۔ آپ فرماتے ہیں "غار میں حضرت رسول خدا کا چھپنا تو جت ہو"

جواب:۔ غرض یہ ہے کہ جس وقت شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے

خلفاء ثلاثہ کے ظلم وقہر پر اس وجہ سے صبر کیا کہ آپ کو اعوان و انصار نہیں مل سکے اور آپ نے لڑنے میں اپنی کمزوریاں دیکھیں تو حضرات اہل سنت اعتراض کرتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام بڑے بہادر اور شیر بلکہ غالب علیٰ کل غالب تھے حضرت نے خلفاء سے کیوں خوف کیا اور اس طرح ان کے ظلم وقہر پر صبر فرمایا۔ لہٰذا شیعہ ان کے جواب میں یہ باتیں کہتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت بڑے بہادر اور اشجع الناس تھے۔ اور جناب امیرؓ ایسے بہادر بھائی بھی ساتھ تھے۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں کافروں سے تقیہ کیا اور غار میں چھپے۔ حالانکہ اگر حضرت چاہتے تو تنہا لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے۔

اعتراض:۔ آپ فرماتے ہیں ''وہ امر جس پر حضرتؐ کو مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا''

جواب:۔ آپ نے حضرت ابوبکر و عمر کے متعلق اشارہ کنایہ میں جو باتیں لکھی ہیں انکی تفصیل کرنے میں طول ہوگا اور بڑی کتابوں میں سب موجود ہے۔ اصل سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ جو باتیں اکثر ہوتی ہیں ان کو ان باتوں کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے جو کبھی کبھی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر بات کی وجہ علیحدہ ہوتی ہے۔ پس اگر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات میں کچھ مجبوریوں کی وجہ سے تقیہ کیا تو اس سے یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ فلاں اوقات میں حضرت نے تقیہ کیوں نہیں کیا کیونکہ جہاں تقیہ نہیں کیا وہاں تقیہ کے شرائط نہیں پائے گئے اور جہاں وہ شرائط پائے گئے حضرتؐ نے تقیہ ضرور کیا۔

اعتراض:۔ آپ نے لکھا ہے ''جناب امیر علیہ السلام کا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرش پر سونا'' الخ

جواب:۔ یہ تو ہم کہتے ہی نہیں کہ تقیہ ہر زمانہ اور ہر جگہ میں واجب ہے۔

جناب امیرؑ آنحضرتؐ کے فرش پر حضرتؐ کے حکم سے سوئے اور اپنی جان کی پروانہیں کی اور جس وقت حضرتؑ کو صبر اور تقیہ کا حکم تھا اس وقت صبر کا جوہر بھی دکھایا اور یہ نہایت مشکل ہے کہ ایسے بزرگ صبر فرمائیں لیکن حضرتؑ احکام خدا کے پابند تھے اور احکام خدا اس افراط و تفریط کے درمیان ہوتے ہیں۔

اعتراض:۔ آپ لکھتے ہیں "جناب امیرؑ کا اپنی لڑکی کو ایسے شخص کے نکاح میں دینا"

جواب:۔ بالکل غلط ہے۔ وہ ام کلثوم حضرت ابوبکر کی بیٹی تھیں چونکہ حضرت ابوبکر کی زوجہ جناب اسماء نے حضرت ابوبکر کے مرنے پر جناب امیرؑ سے نکاح کرلیا تھا جس کی وجہ سے ام کلثوم بھی اپنی ماں کے ساتھ جناب امیرؑ کے ہاں رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کو جناب امیرؑ کی بیٹی کہہ دیا۔

ساتواں اعتراض

جس جگہ سچ بولنے سے دنیوی نقصان کا اندیشہ ہو وہاں سچ ہی کو اختیار کرنا اچھی صفت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو حضرات ائمہ میں کیوں نہیں پائی گئی جو مکارم اخلاق کے پورے کرنے والے اور حضرت موسیٰؑ، عیسیٰؑ سے افضل تھے۔ اور اگر اچھی صفت نہیں ہے تو جبن (بزدلی) اور شجاعت (بہادری) کی تعریف بتایئے۔

جواب

اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ حضرات ائمہ طاہرینؑ نے مال و دولت ضائع ہونے کے خوف سے تقیہ کیا تھا تو بالکل غلط ہے کیونکہ ان حضرات نے کبھی بھی ان حقیر اور ذلیل چیزوں کے لئے ایسا نہیں کیا۔ البتہ اپنا پاکیزہ اور قیمتی نفوس، اپنے دوستوں شیعوں کی پیاری اور عزیز زندگی اور دین حق و کلمہ اسلام کے تلف اور ضائع ہونے کے خوف سے تقیہ کیا تھا اور اس کو دنیوی نقصان کہنا کمال عقلمندی

ہے۔ کیونکہ یہ تو خالص دینی نقصان اور مذہبی مضرت تھی۔ خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں جو شخص جناب امیرؑ کا نام لیتا اس تک کو لوگ قتل کر دیتے تھے۔ پس اگر حضرات ائمہ علیہم السلام اور ان کے شیعہ اس وقت تقیہ نہیں کرتے تو کل مومنین کی ہلاکت کی نوبت پہنچ جاتی۔ اور دنیا سے دین حق اور خدا کی حجتیں ضائع ہو جاتیں۔ باوجود ان باتوں کو اچھی طرح جاننے کے تقیہ پر آپ کا منہ آنا آپ ہی کا کام ہے۔ اور پہلے علامہ غزالی اور علامہ عینی کی عبارتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ نبی یا ولی یا خود مسلمانوں کی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے بلکہ علامہ عینی نے تو تصریح کر دی ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی شخص کی امانت کو غصب کر لینے کی نیت سے دریافت کرے تو امین (جسکے پاس وہ امانت ہے اس) پر واجب ہے کہ جھوٹ بولے اور اس امانت سے انکار کر دے۔ اسی طرح علامہ نواوی نے لکھا ہے کہ فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی شخص کو قتل کرنے کے لئے تلاش کرے یا لوٹنے چھیننے کے لئے کسی کا مال پوچھے تو اس شخص یا اس مال کو چھپانا اور جھوٹ بول کر اس سے انکار کر دینا واجب ہے۔ باوجود اس کے معترض صاحب نے جو سوال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس امر کو خدا نے واجب کیا ہے وہ معاذ اللہ بزدلی اور بری صفت ہے۔

آٹھواں اعتراض

جس صورت میں کہ دونوں فریقوں (شیعہ و سنی) کے راویان حدیث کے معتبر و غیر معتبر ہونے کے طریقے مساوی ہوں اور دونوں طریقوں میں جھوٹ، نسیان، وہم، تعلیل کا احتمال بھی پیدا ہوتا ہو۔ تب اس روایت میں جو ایسے راویوں کی بیان کی ہوئی ہو جو اپنے معتبر راویوں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ جان کر حدیثیں گھڑتے تھے اور شرعاً اس وضع حدیث کو ان کے لئے جائز بھی

جانتے ہیں اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ امام نے ان راویوں سے بعض کے متعلق جھوٹ بولنے کی گواہی بھی دی ہے۔ اور اس روایت میں جو ایسے راویوں کی بیان کی ہوئی ہے جو اپنے معتبر راویوں کے ایسے جھوٹ کو نہ واقع سمجھتے ہیں اور نہ شرعاً ان کے لئے جائز جانتے ہیں اور حضرت خاتم النبیینؐ سے ان کے جھوٹ پر گواہی بھی روایت نہیں کرتے ہیں۔ ایسی دو روایتوں میں عقل کے اعتبار سے کہ ہمارے اور آپ کے اعتقادی امور میں وہی مدار ہے۔ کون سی روایت قابل ترجیح اور واجب التسلیم ہے۔

جواب

اس اعتراض میں جو مناقشات ہیں ان سب سے قطع کر کے مختصر جواب یہ ہے کہ جمہور شیعہ کے نزدیک چونکہ حدیث کے راویوں کا عادل ہونا شرط ہے اور وہ ایمان کی فرع ہے (یعنی جو مومن اور شیعہ ہوگا وہی عادل ہوسکتا ہے) لہذا سنی راویوں کی حدیث شیعہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور آپ کا یہ جو گمان ہے کہ سنی راویان حدیث معتبر موثق ہوتے ہیں اور وہ جھوٹی حدیثیں وضع نہیں کرتے ہیں اور ان کے جھوٹے ہونے کی گواہی رسولؐ نے نہیں دی تو یہ سب باتیں غلط اور خلاف واقع ہیں۔ بلکہ یہ کل برائیاں حضرات اہل سنت کے بڑے مشہور اور مقبول و مقدس راویوں میں موجود تھیں (چنانچہ آپکی معتبر کتابوں میزان الاعتدال، لسان المیزان وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کتنے بڑے بڑے راوی کیسے جھوٹے اور جعل ساز اور مفتری تھے) اور جن حدیثوں کو شیعہ راویوں نے تقیہ کے محل میں روایت کیا ہے وہ سب مذہب اہل سنت کے موافق اور حضرات ائمہ کی دوسری حدیثوں کے مخالف ہونے کی وجہ سے بہت آسانی سے پہچان لی جاتی ہیں۔

غرض راویوں کے تقیہ کرنے کی وجہ سے حق اور باطل میں اشتباہ نہیں ہو سکتا ہے اور معترض صاحب نے لطف کا معنی پوچھا ہے تو علماء نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے ما یقرب العبد الی الطاعۃ و یبعدہ عن المعصیۃ بحیث لا یبلغ الیحد الالجاء یعنی وہ بات جو بندے کو خدا کی اطاعت سے قریب اور اس کی مخالفت سے دور کردے اس حیثیت سے کے بے بس کرنے کی حد تک نہ پہنچے اور اس معنیٰ پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوسکتا ہے۔

نواں اعتراض

بندوں کے کاموں کو شیعہ کہتے ہیں کہ بندوں ہی کے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ بندوں کی قوت ارادیہ کو ان کاموں سے تعلق ہوتا ہے تو ہم بھی اس کو مانتے ہیں جو بدیہی ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ بندوں کے کاموں کی پیدائش میں خدا کی مشیت کو کوئی دخل نہیں ہے تو پھر آیتوں کا کیا مطلب ہے۔ الا ان یشاء اللہ (جب تک اللہ کسی بات کو نہ چاہے تم لوگ کچھ چاہ نہیں سکتے) (پ ۲۹ ع ۳۰) وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ یعنی کسی نفس کو اختیار نہیں ہے کہ خود سے ایمان لائے جب تک اللہ اجازت نہ دے (پ ۱۱۔ ع ۱۵)

جواب

بندوں کے کاموں کو جو شیعہ کہتے ہیں کہ بندوں ہی کے پیدا کئے ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے ان کاموں کو اپنے ارادہ اور اختیار سے بغیر کسی جبر یا بے بسی کے انجام دیتے ہیں اور خدا کی مشیت بری باتوں سے متعلق ہوتی ہی نہیں کیونکہ اس کی خرابی بدیہی طور پر ثابت ہے کیونکہ ہر شخص کی عقل یہ کہتی ہے کہ برا کام (مثلاً شراب پینے۔ چوری کرنے وغیرہ) کو خدا نہیں چاہتا

ہے۔ اور آیہ ماتشاؤون الا ان یشاء اللہ کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ خود سے ایمان نہیں لا سکتے جب تک خدا تمہارے ایمان لانے کے اسباب نہ مہیا کردے (مثلاً دنیا میں رسول بھیج دیئے اور اپنے احکام بتا دیئے۔ حق اور باطل کے راستے الگ الگ معین کردیئے) اور آیت مبارکہ وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ کے متعلق علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ قاضی نے بیان کیا ہے مراد یہ ہے کہ بغیر اللہ کے علم یا تکلیف یا قدرت دینے کے کوئی شخص ایمان نہیں قبول کرسکتا۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۴۴) اس کے بعد علامہ موصوف نے اس کا جواب دیا ہے کہ اذن (اجازت) کے لفظ سے علم تکلیف اور قدرت پیدا کرنے کا معنے لینا ظاہر کو چھوڑنا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ خاص کر جب ہم بیان کرچکے ہیں کہ دلیل یقینی جو عقلی بھی ہے ہمارے ہی قول کی تائید کرتی ہے (تفسیر کبیر ج ۵۔ ص ۴۴) مگر علامہ رازی کا یہ بیان درست نہیں ہے کیونکہ اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ لفظ اذن کا معنے علم وغیرہ لینے سے ظاہر کا چھوڑنا ہے لیکن جب ظاہر کے خلاف پر کوئی دلیل قائم ہو تو جائز ہے اور اس جگہ خلاف ظاہر مطلب ہونے کے لئے بکثرت واضح دلیلیں موجود ہیں جو متعدد کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جن کو یہ باتیں بہت شرح اوسط سے دیکھنے کی خواہش ہو حضرت شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری نور اللہ مرقدہ الشریف کے رسالہ کا مطالعہ کرے۔

اعتراض: آپ حضرات ان باتوں کو امام کے لئے جائز جانتے ہیں یا نہیں (۱) امام خدا کی طرف سے مقرر ہو (۲) معصوم ہو (۳) اس کی امامت کے جو منکر ہوں ان کو معجزہ دکھا سکے (۴) خدا کی درگاہ سے غیب کے علوم حقہ حاصل کرے (۵) لوگوں کو ان علوم کی طرف دعوت دے اور یہ کہ (۶) ان علوم پر

یقین رکھنا امامت کی شرط ہے۔ اگر جائز ہے تو نبوت اور امامت کے درمیان فرق بیان کیجئے۔ اگر آپ کہیے کہ فرق یہ ہے کہ نبی اصل اور امام اس کا قائم مقام ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ تو صرف لفظی فرق ہے جو دو مراد لفظوں میں ہوتا ہے یسے رسول کو رسول نہیں نبی کہا یا پیغمبر کہا۔

جواب: اس قسم کے سوالات تو بے کار سے معلوم ہوتے ہیں اگر فرض کر لیجئے کہ نبوت و امامت میں سوا لفظی فرق کے کوئی فرق ہی نہیں ہے تو ہم پوچھیں گے کہ اس میں خرابی کیا ہے۔ اگر آپ یہ خرابی نکالئے کہ اس صورت میں ائمہ کا درجہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر ہوجاتا ہے تو یہ مہمل خیال ہے کیونکہ کسی کام میں دو شخصوں کے متحد ہونے سے فضل و کمال میں بھی دونوں کا متحد ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضرت رسول خداؐ اور انبیاء کام (ہدایت) میں متحد تھے (یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہدایت کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور دوسرے انبیاء بھی) مگر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باقی کل انبیاء سے افضل تھے۔ اسی طرح اگر اسلام کی اشاعت کرنے میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات ائمہ متحد ہوں تو اس سے یہ کیوں لازم آئیگا کہ حضرات ائمہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر بھی ہو جائیں (دنیا میں بھی ایک شخص کام انجام دینے کو دوسرا شخص اس کا قائم مقام ہوتا ہے مگر اس سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ فضل و کمال میں اس کے برابر ہو جائے)

اعتراض: تواتر سے ثابت ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے درخت کے نیچے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی جس کی وجہ سے خدا نے ان حضرات کی شان میں یہ آیت نازل کی لقد رضی اللہ من المومنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل

السکینۃ علیھم واثابھم فتحاً قریبا یعنی یقیناً اللہ مومنین سے راضی ہوا جب وہ مومنین تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ غرض خدا ان کی دلی حالت سے باخبر ہوگیا تب ان پر اپنی تسلی نازل فرمائی اور بہت قریبی فتح عنایت کی (پ۲٦۔ ع۱۱)

جواب: ۱ حضرت عثمان تو بیعت رضوان کے وقت حاضر ہی نہیں تھے لہٰذا ان کو ان میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ اور بیعت کرنے والوں سے خدا خدا کی خوشی ایمان سے مشروط تھی۔ پس پہلے آپ حضرت ابوبکر وعمر کے ایمان کو ثابت کیجئے اُسکے بعد اس آیت سے انکی فضیلت پر استدلال کرنیکی کوشش کیجئے گا۔ فقط۔۔۔

ان روایتوں سے یہ تو یقیناً ثابت ہوگیا کہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان

---

۱ یہ آیت پکار کر کہہ رہی ہے کہ خدا کل صحابہ سے راضی نہیں ہوا۔ کل بیعت کرنے والوں سے راضی نہیں ہوا بلکہ صرف مومنین سے راضی ہوا اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ اس وقت جب وہ بیعت کر رہے تھے ان سے خوش ہوگیا۔ یعنی مومنین کی بیعت کو اس نے پسند کرلیا۔ اسکے قبل ان سے راضی تھا یا نہیں اور اسکے بعد ان سے راضی رہا یا نہیں۔ اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید ہی کی دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے تو حقیقت امر واضح ہوجائیگی۔ ارشاد ہوتا ہے: یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمن ورضی لہ قولا یعنی قیامت کے دن کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی مگر جس کو خدائے رحمن اجازت دے اور اس کا بولنا پسند فرمائے (پ ١٦۔ ع ١٥) یعنی قیامت کے بولنے کو خدا فرماتا ہے کہ پسند کرلے۔ اس کے قبل بولنے والے سے راضی تھا یا نہیں اس کا بالکل ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرماتا ہے کہ جس وقت مومنین بیعت کر رہے تھے اس وقت خدا ان سے راضی ہوا یعنی ان کی بیعت کرنے کو پسند کیا مگر بعد کو بھی ان سے راضی ہوا یا نہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔ جس طرح ایک لڑکے نے اسکول میں پہلے دن اپنا سبق یاد کرکے سنا دیا تو اس کے ماسٹر اس سے راضی ہوئے مگر دوسرے دن اس نے یاد نہیں کیا اور کسی سوال کا جواب نہیں دیا تو کیا اب بھی یہی کہا جائے گا کہ اس کے ماسٹر تو اس سے راضی ہوگئے ہیں؟ کیا دوسرے روز بھی اس کے ماسٹر اس سے خوش رہینگے؟ کتنے لڑکے ہیں کہ انٹرنس کے امتحان میں اچھے پرچے لکھتے ہیں تو ممتحن ان کے جوابوں کو پسند کرکے اس کو پاس کردیتے ہیں مگر وہی لڑکے ایف اے کے امتحان میں خراب پرچے لکھتے ہیں تو ممتحن ان کے جوابوں کو ناپسند کرکے انہیں فیل کردیتے ہیں۔ یہ تو ہر روز کے مشاہدات ہیں۔ اسی وجہ سے خود ان صحابہ کو جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی اپنے اس شرف پر اطمینان نہیں تھا اور اپنے بعد کے کارناموں سے خوب سمجھتے تھے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اگر بیعت الرضوان کی فضیلت ان کی آئندہ نجات کے لئے بھی ضمانت ہوتی تو وہ بھی پریشان نہ ہوتے اور حسرت کا دم نہ بھرا کرتے۔ اس کتاب کی روایت ملاحظہ ہو جسکے بارے میں برادران سنت سے کسی شخص کو [illegible] ہوسکتا۔ یعنی صحیح بخاری کی جو حسب ذیل ہے۔ (باقی ص ۱۵۷ پر ملاحظہ ہو)

حضرت رسول خداؐ کو غزوات میں چھوڑ کر بھاگ جاتے اور بغیر اجازت لئے چلے جاتے تھے۔ اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے تھے ان کو خدا مومن جانتا ہے یا نہیں۔ اگر خدا انہیں مومن کہے تو چشم ما روشن و دل ما شاد۔ لیکن اگر وہ ان کو کافر کہہ دے تو ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو خدا فرماتا ہے۔ انما المومنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ ان الذین یستاذنونک اولئک الذین یومنون باللہ و رسولہ یعنی مومنین تو صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور جب کسی ایسی بات کے لئے جسمیں لوگوں کے جمع رہنے کی ضرورت ہے پیغمبرؐ کے پاس ہوتے ہیں تو جب تک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۶)

عن العلاء بن المسیب عن ابیہ قال لقیت البراء بن عازب فقلت طوبی لک صحبتہ رسول اللہ ﷺ و بایعتہ تحت الشجرۃ فقال یا ابن اخی انک لا تدری ما احدثنا بعدہ یعنی مسیب سے مروی ہے کہ میں نے براء بن عازب سے ملاقات کی تو ان سے کہا کہ خوشا حال تمہارا کہ تم نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور بیعت رضوان کا شرف حاصل کیا ہے۔ یہ سن کر براء نے کہا لیکن اے بھتیجے تم نہیں جانتے کہ ہم لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیا کیا گل کھلائے ہیں (صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوہ حدیبیہ پارہ ۱۶۔ ص ۱۷ مطبوعہ دہلی) صحابہ کا قول ان حضرات کے ہاں بڑی حجت ہے اگر بیعت رضوان سے خدا ان سے ہمیشہ کو راضی ہو جاتا تو اتنے بڑے صحابی مبارکباد کا جواب یہ کیوں دیتے کہ تمہیں ہم لوگوں کے بعد کے کارناموں کا علم نہیں ہے اگر ان کو بھی جانتے تو مبارکباد نہیں دیتے۔ کیونکہ اب ہم لوگ مبارکباد دینے کے قابل نہیں رہے بلکہ تعزیت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے جب یہ صحابہ آنحضرتؐ کے پاس حوض کوثر پر آئینگے تو دھکے دیکر نکال دیئے جائیں گے۔ آنحضرتؐ ارشاد فرمائیں گے کہ اے اللہ یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ خدا فرمائے گا مگر تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے بعد ان لوگوں نے کیا شر و فساد بپا کیا۔ یہ لوگ پچھلے پاؤں مرتد ہو گئے (صحیح بخاری پ ۲۷۔ ص ۲۱۶) آیت مذکورہ سے خلفاء ثلاثہ کو اسی وقت نفع ہو سکتا ہے جب پہلے ان کا ایمان ثابت ہو لے۔ کیونکہ خدا نے یہ تو فرمایا نہیں ہے لقد رضی اللہ عن الذین یبایعونک یعنی خدا ان لوگوں سے راضی ہوا جو تمہاری بیعت کر رہے تھے نہ یہ فرمایا ہے لقد رضی اللہ عن المسلمین اذ یبایعونک یعنی خدا مسلمانوں سے راضی ہوا جو تمہاری بیعت کر رہے تھے۔ نہ یہ فرمایا لقد رضی اللہ عن اصحابک اذ یبایعونک یعنی خدا تمہارے اصحاب سے راضی ہوا جب وہ تمہاری بیعت کر رہے تھے کہ اگر خدا اس قسم کا لفظ بولے ہوتا تو سب بیعت کرنے والے مراد ہو سکتے تھے۔ مگر یہاں تو خدا بیعت کا ذکر کرنے سے پہلے مومنین کا آہنی لفظ رکھ دیتا ہے جس سے وہ سب بیعت کرنے والے علیحدہ ہو جاتے ہیں جو خدا کے نزدیک بیعت کرنیوالے تو تھے مگر ایماندار نہیں تھے۔ یا بیعت کرنیوالے مسلمان تھے مگر مومن نہیں تھے۔ یا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸ پر)

پیغمبرؐ سے اجازت نہ لے لیں وہاں سے ہٹتے نہیں ہیں۔ اے رسولؐ جو لوگ تم سے اجازت لے لیتے ہیں جس حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں (پ ۱۸۔ سورہ نور آیۃ ۶۲) اس آیت میں امر جامع سے مراد جہاد اور غزوات ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر در منثور۔ ج ۵۔ ص ۶۰ و تفسیر کبیر۔ ج ۶۔ ص ۴۳۹۔ و تفسیر خازن۔ ج ۳۔ ص ۳۴۱۔ و تفسیر کشاف۔ ج ۲۔ ص ۳۱۹ وغیرہ) معلوم ہوا کہ جو لوگ غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے وہ مومنین نہیں تھے بلکہ نافرمان ہو جاتے تھے۔ جسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب غزوہ احد میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو دیکھا کہ آپ کے پہلو میں کھڑے ہیں اور آپ سے پوچھا اے علیؑ تم بھی ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں بھاگ گئے؟ تو حضرت علیؑ نے فرمایا: رسول اللہ اأکفر بعد الایمان اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷)

بیعت کرنے والے صحابہ تھے مگر صفت ایمان انمیں نہیں پائی جاتی تھی اور صرف وہ بیعت کرنے والے باقی رہ جاتے ہیں جو مومنین تھے ان سے بیشک خدا راضی ہوا جسمیں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کی بھی تحقیق فرمالیں کہ خلفاء ثلاثہ بیعت رضوان کے وقت تک ایماندار باقی بھی رہے تھے یا نہیں اگر ان ایمان باقی رہا ہو تو وہ ان مومنین سے ہو سکتے ہیں جن سے خدا بیعت الرضوان کی وجہ سے راضی ہوا۔ اگر یہ صفت ان سے زائل ہو چکی تھی تو نہ وہ مومنین سے ثابت ہونگے نہ ان سے خدا کی رضا ثابت ہوگی۔ کل کتابیں گواہ ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اسکے قبل کئی غزوے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر اور بغیر حضرت سے اجازت حاصل کئے چلے گئے تھے۔ امام حاکم و شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی و علامہ دیار بکری وغیرہ سیکڑوں مورخین و محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ جب بروز جنگ احد اور لوگ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ گئے انمیں سے اولاً میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میری نگاہ دور سے آنحضرت پر پڑی (مستدرک و قرۃ العینین و تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۴۸۵) اور علامہ فخر الدین رازی نے لکھا ہے: ومن المنهزمين عمر الا انه لم يكن في اوائل المنهزمين ولم يبعد بل ثبت على الجبل و منهم ايضاً عثمان رضی الله عنه انهزم یعنی جنگ احد سے بھاگنے والوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ سب سے پہلے نہیں بھاگے اور بہت دور بھی نہیں بھاگے بلکہ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے اور ان بھاگنے والوں سے حضرت عثمان بھی تھے (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۴۷) اسی طرح ان حضرات کے بھاگنے کے واقعات تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۰ و مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۵۲ و منہاج النبوۃ ج ۲ ص ۳۶۲ و تاریخ خمیس ج ۱ ص ۳۸۲ وغیرہ میں بھرے ہیں۔

ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا؟ (مدارج النبوۃ ۔ ج ۲۔ ص ۱۵۲) یعنی آنحضرت کو غزوے میں چھوڑ کر جو لوگ بھاگ جاتے تھے وہ نافرمان ہو جاتے تھے۔ اور خلفاء ثلاثہ کا بھاگ جانا اوپر ثابت کر دیا گیا۔ لہٰذا کسی قاعدہ سے یہ مومنین کہے جا سکتے ہیں نہ بیعت الرضوان کے وقت خدا کا ان سے راضی ہونا کسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔

اھم اعلان

عالم ربانی، نور العلماء ، روحانی شخصیت، حجتہ الاسلام والمسلمین

علامہ سید نور حسین شاہ کاظمی اعلی مقامہ ونور اللہ مرقدہ

اوران کے عزیز فرزند

عالم باعمل، وقف فی الدین والمومنین، حجتہ الاسلام والمسلمین

علامہ سید قلب عباس کاظمی مدظلہ العالی

کی دینی، مذہبی وعلمی خدمات اوران کی لازوال شخصیات کے تعارف پر

مبنی کتاب بہت جلد منصہ شہود پر

جلوہ گر ہوکر قارئین وتشنگان علم کے استفادہ کے لیے حاضر ہوگی

مرکز مطالعات اسلامی پاکستان

التماس دُعا برائے بلندیٔ درجات

والدین مرحومین

حجۃ الاسلام

علامہ سید کلب عباس کاظمی

النور اکیڈمی گاہی سیداں ضلع راولپنڈی

دارالعلوم محمدیہ ٹرسٹ پاکستان (رجسٹرڈ) بلاک نمبر 19 سرگودھا